متفق ہونے کے لئے بحث کیجئے

دفتری زندگی میں کارکنوں کے آپس کے اختلافات اوران کی باہمی کشیدگی دفتر کی فضا کو سب سے زیادہ خراب کرتی ہے اور اسے دوسروں کے لئے بھی ناگوار یا ناقابل برداشت بناتی ہے۔ اکثر اوقات یہ کشیدگی اور تناؤ بے مقصد ہوتا ہے۔ ویسے تو اختلاف رائے یا کشیدگی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا لیکن یہ بہر حال زندگی کا حصہ ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی موڑ پر اس سے واسطہ پڑتا ہے اختلاف رائے اگر تعمیری اور با مقصد ہو تب بھی غنیمت ہے، لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے۔

اختلاف رائے کی بنیاد کچھ بھی ہو سکتی ہے، کرکٹ، فٹبال، دوسرے کھیل، شوبز، سیاست، ملکی نظام، حالات حاضرہ..... غرض یہ کہ ہر موضوع پر ہر شخص کی اپنی ایک رائے ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ دوسرا اس سے متفق ہو لیکن زیادہ تر لوگوں میں ایک بڑی خرابی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں دفتری زندگی میں اگر اختلاف رائے ہو بھی ..... تو وہ دفتری معاملات پر ہی ہونا چاہئے، دفتری معاملات میں اختلاف رائے تعمیری اور با مقصد بھی ہو سکتا ہے اور اس کی بدولت دفتر کے بعض بڑے مسائل کو حل کرنے یا کسی بڑے ہدف کو حاصل کرنے میں مدد بھی مل سکتی ہے۔ لیکن اس میں خلوص نیت بنیادی شرط ہے۔ اگر اختلاف رائے کسی مسئلے کو بہتر انداز میں حل کرنے کی نیت سے ہو تب تو ٹھیک ہے لیکن اگر اس کی تہہ میں اپنی برتری ثابت کرنے یا اپنے آپ کو زیادہ لائق ظاہر کرنے کی خواہش کارفرما ہو تو اس کا نتیجہ دفتری ماحول میں بدمزگی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔

بعض اوقات کمپنیوں کے ارباب اختیار، کارکنوں کے آپس کے اختلافات سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ''لڑو اور حکومت کرو'' والی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن صاحبان اختیار اگر کمپنی اور مالکان سے مخلص ہوں تو وہ کبھی دفتری ماحول میں اختلاف رائے پیدا ہونے والی کشیدگی کو پسند نہیں کر سکتے۔ وہ اسے ختم کرانے اور مسئلے کا متفقہ حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی دفتر میں بااختیار پوزیشن پر کام کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے ماتحتوں میں بے مقصد قسم کا اختلاف رائے دفتر کے ماحول کو کشیدہ کر رہا ہے تو فوراً اس طرف توجہ دیجئے اور متعلقہ افراد کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے فوری طور پر بہ ذات خود دفتر کا کوئی مسئلہ زیر بحث لے آیئے اور اس کے بارے میں اپنے سامنے اس کو اظہار خیال کا موقع دیجئے تاکہ بے مقصد تنقید اور اختلاف کا رخ ایک تعمیری اور با مقصد بحث کی طرف مڑ جائے۔ آپ خود اس بحث میں حصہ لیجئے، ہر طرح کے نکتہ نظر کو غور سے سنئے، ان میں جو اچھی بات مشترک ہوں ان کی تعریف کیجئے، اس طرح رفتہ رفتہ انہیں با مقصد اور تعمیری انداز میں اختلاف رائے کا شمار کرنے اور پھر درست نکات پر ایک دوسرے سے متفق ہونے کی عادت پڑے گی۔ کارکنوں کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کیجئے کہ کسی دوسرے کی معقول بات کو تسلیم کر لینے یا کسی اچھے نکتے پر متفق ہونے سے انسان کی توہین نہیں ہوتی بلکہ اس کی عزت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سطحی ذہنیت کے انسانوں کو عام طور پر جو چیز دوسروں کے ساتھ متفق ہونے یا کسی معقول بات کو تسلیم کرنے سے روکتی ہے وہ ان کی انا اور لاشعوری احساس کمتری ہوتا ہے۔ ان کے لاشعور میں کہیں یہ خیال بیٹھا ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے دوسرے کی بات مان لی تو شاید ان کا قد کم ہو جائے گا۔ آپ ان کے سامنے خود دوسروں سے کسی مسئلہ پر اختلاف رائے اور بحث شروع کر کے رفتہ رفتہ اپنی رائی سے دست بردار ہوتے ہوئے ان کی بات کی قائل ہونے اور ان سے متفق ہونے کا مظاہرہ کیجئے۔

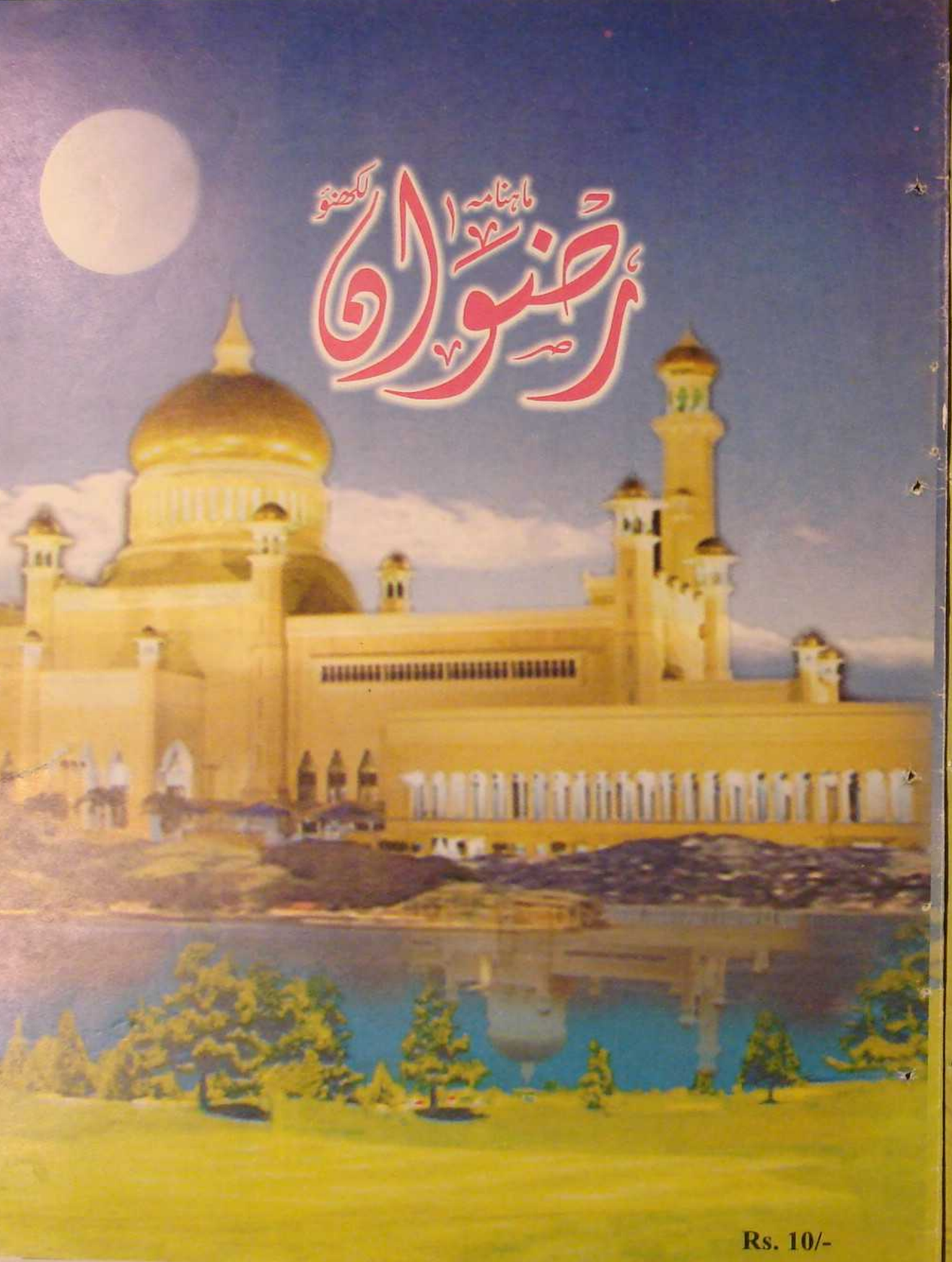

Rs. 10/-

LW/NP-184/2006-08
R. N. 2416/57

Monthly

RIZWAN

Ph: 0522-2270406
172/54 Mohammad Ali Lane Gwynne Road Lucknow-226018

DESIGNED BY HAMID, Mob: 9415769282 PRINTED AT: KAKORI OFFSET PRESS, LUCKNOW.

بیادگار حضرت مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

خواتین کا ترجمان

ماہنامہ

رضوان

لکھنؤ

جلد ۵۱	فروری ۲۰۰۷ء	شمارہ ۲

ایڈیٹر

محمد حمزہ حسنی

معاونین

- میمونہ حسنی
- عائشہ حسنی
- جعفر مسعود حسنی
- محمود حسن حسنی

سالانہ چندہ

برائے ہندوستان : ۱۰۰/روپے

غیر ملکی ہوائی ڈاک : ۲۵/امریکی ڈالر

فی شمارہ : ۱۰/روپے

ڈرافٹ پر RIZWAN MONTHLY لکھیں

ماہنامہ رضوان ۱۷۲/۵۴، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸

Phone : 91 - 0522 - 2270406

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد حمزہ حسنی نے مولانا محمد ثانی حسنی فاؤنڈیشن کیلئے نظامی آفسیٹ پریس میں چھپوا کر دفتر رضوان محمد علی لین سے شائع کیا

کمپوزنگ : ناشر کمپیوٹر لکھنؤ۔ فون : 0522 - 2281223

فہرست مضامین

- اپنی بہنوں سے ..... مدیر ۳
- حدیث کی روشنی ..... لمۃ اللہ تسنیم ۴
- دین کا نبوی مزاج ..... حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۶
- کلام نبوی ﷺ کی تاثیر ..... مولانا سید عزیز الرحمٰن ۱۰
- اختلاف امت اور ان کا حل ..... مفتی محمد شفیع ۱۶
- حضرت ابوبکر - چند باتیں حیات سے محترم عبدالواحد شاکر ۲۲
- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ..... یوری آویزی ۲۵
- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں احترام نسواں .. محترم نصیر خاں ۲۸
- مولانا آزاد کی تربیت میں ان کی والدہ کا حصہ ..... شبانہ بیگم ۳۰
- والدین کی خدمت دخول جنت کا ذریعہ.....انجم فاطمہ..... ..... ۳۳
- اسلام کے نظریۂ یوم حساب نے مجھے مسلم بنادیا ۳۵
- سعودی عرب میں جرائم کی شرح بہت کم .... مفتی اشتیاق احمد ۳۸
- متفق ہونے کے لئے بحث کیجئے ۴۰

اپنی بہنوں سے

مدیر

محرم الحرام اسلامی ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے، اس مبارک مہینہ سے اسلامی سال شروع ہوتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جنوری سے شروع ہونے والے عیسوی سال کو سب جانتے ہیں اور یکم جنوری کو ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں، تہنیتی کارڈ بھیجے جاتے ہیں، اور ٹیلیفون، موبائل کے ذریعہ مبارک باد کی بھرمار ہو جاتی ہے، جس میں بڑی تعداد مسلمان خواتین اور مردوں، بچوں کی بھی ہوتی ہے اور اس پر بڑا پیسہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جو کہ غیروں کا سن ہے اور یورپ کے اسلام دشمن معاشرہ کے تہوار کی حیثیت رکھتا ہے اور یورپی تہوار کی طرح منایا بھی جاتا ہے اور اس کی تقریبات، بے حیائی، شراب نوشی اور بہیمیت سے آباد ہوتی اور رونق پاتی ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ مسلمان کا کوئی تعلق عیسوی سنہ سے نہیں ہے اور اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ اس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی نہیں ہے بلکہ رومی معاشرہ سے اس کا تعلق ہے اسی لیے اسی قسم کے افعال و کردار، سال نو کی تقریبات میں انجام پاتے ہیں، جن کا انسانیت کے شرف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور آپ کی پاک زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔

اس لئے ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں میں، خط و کتابت میں اسلامی سال کا استعمال کریں تو ہمارے کاموں میں برکت بھی ہوگی اور ہم ملت اسلامیہ سے وابستہ بھی رہیں گے اور جب بھی ہم ہجری تاریخوں کا استعمال کریں گے تو ہمارے ذہنوں میں ہجرت نبوی اور سیرت نبوی کی یاد تازہ ہوگی، جو ہمارے لیے ایمان کی بادبہاری ثابت ہوگی۔

محرم الحرام کو غم کا مہینہ سمجھنا بہت بری بات ہے کون سا مہینہ ہے، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مجاہدین اسلام، علماء کی شہادت کا واقعہ نہ پیش آیا ہو، اور اللہ کی راہ میں شہادت ایسی نعمت عظمیٰ ہے، جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہوتی ہے، شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہو، جو اللہ کی راہ میں جان دینے کو اپنی اور اپنے خاندان کے لیے خوش قسمتی نہ سمجھتا ہو۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ کے راستہ میں اللہ کے جو نیک بندے شہید ہوئے ان کا غم منانا اور اس کو نعمت اور خوش قسمتی کے بجائے زحمت اور دکھ کی بات سمجھنا دراصل بدقسمتی اور بے توفیقی ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حدیث کی روشنی میں

آدابِ سفر

امۃ اللہ تسنیم

سواری پر سوار ہوتے وقت حضورؐ کی دُعا

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے اور سواری پر سوار ہوتے تو تین بار تکبیر کہتے اور پھر فرماتے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ، وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ○

پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے بس میں کردیا۔ ہم ایسے نہ تھے کہ اس کو قابو میں لاتے اور بے شک ہمیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر فرماتے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ فِیْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِی الْاَهْلِ،

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَالْوَلَدِ ○

اے اللہ ہم اس سفر میں آپ سے نیک اور پرہیزگاری کا سوال کرتے ہیں اور اس عمل کا جس سے آپ راضی ہیں۔ اے اللہ اس سفر کو ہم پر آسان فرمادیجئے اس کی دوری کو لپیٹ دیجئے۔ اے اللہ آپ سفر میں ساتھی بھی ہیں اور گھر کے لوگوں کے خبر گیر بھی ہیں، اے اللہ میں آپ سے سفر کی سختی سے بُرے منظر سے اور گھر، مال اور اولاد کو بُری حالت میں دیکھنے سے پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب سفر سے واپس ہوتے تو یہ کلمات بھی اول الذکر دعا میں شامل فرمالیتے تھے۔

اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ، لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ.

ہم سفر سے واپس ہونے والے ہیں۔ توبہ کرنے والے ہیں۔ عبادت کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی تعریف کرنے والے ہیں۔

جن چیزوں سے پناہ مانگنی چاہئے

حضرت عبداللہ بن سَرجسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر کے لئے تشریف لے جاتے تو سفر کی سختی، راحت کے بعد تکلیف، مظلوم کی بددعا اور اہل ومال کی طرف بُرائی دیکھنے سے پناہ مانگتے تھے۔ (ترمذی۔نسائی)

سوار ہونے کا طریقہ اور اس کے اذکار

حضرت علی بن رَبیعہؓ سے روایت ہے کہ علیؓ بن ابی طالب کے لئے جب سواری لائی گئی تو اس وقت میں موجود تھا۔ انہوں نے جب اس کی رکاب پر پیر رکھا تو بسم اللہ کہا۔ پھر جب پیٹھ پر بیٹھ گئے تو کہا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ، وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ○

اس اللہ کی تعریف ہے جس نے اس کو ہمارے لئے مسخر کردیا۔ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

پھر تین مرتبہ الحمد للہ کہا، پھر تین بار اللہ اکبر کہا۔ پھر یہ دعا پڑھی۔

سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ.

پاک ہیں تو بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ بس مجھ کو بخش دے اور تیرے سوا کوئی بخشنے والا نہیں۔

یہ کہہ کر ہنس دئے، لوگوں نے کہا اے امیرالمومنین آپ ہنستے کیوں ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا تھا جس طرح میں نے کیا اور جب آپ ہنسے تو میں نے بھی عرض کیا تھا یا رسول اللہ کس بات نے آپ کو ہنسایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا تمہارا رب پاک ہے۔ اس کے بندے جب کہتے ہیں کہ اے رب مجھے بخش دے تو پھر وہ خوش ہوتا ہے کہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی بخشنے والا نہیں۔ (ابوداؤد۔ترمذی)

چڑھتے اور اُترتے کیا کہنا چاہئے

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم بلندی پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور پستی کی طرف آتے تھے تو تسبیح کرتے تھے (اور بہت چیخ کر تکبیر کہنے کی ممانعت ہے) (بخاری)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے لشکری جب بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے تھے اور جب بلندی سے اترتے تھے تو تسبیح کرتے تھے۔

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حج اور عمرہ سے واپس ہوتے تھے یا کسی گھاٹی پر چڑھتے تھے تو تین بار تکبیر کہتے تھے اور پھر فرماتے تھے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ، اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ، صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ. (بخاری۔مسلم)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہی ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے (اسی کی بادشاہت ہے) اسی کے لئے سب تعریف ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اللہ کی حمد کرنے والے، اللہ نے اپنے وعدہ کو سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور اس اکیلے نے لشکروں کو شکست دی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ میں سفر کرنے والا ہوں، آپ مجھے کچھ وصیت فرمائیے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرتے رہنا اور ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے تکبیر کہنا، جب وہ آدمی چلا گیا تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ اس کی مسافت کو لپیٹ دے اور اس پر سفر آسان کردے۔ (ترمذی)

معتدل آواز کے ساتھ دُعا وذکر

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے جب کسی میدان میں پہنچتے تو بہت بلند آواز سے تکبیر تہلیل کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو اس لئے کہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو تم تو اس کو پکارتے ہو جو سننے والا قریب ہے اور تمہارے ساتھ ہے۔

مسافر کی دُعا قبول ہوتی ہے

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں (۱) مظلوم کی (۲) مسافر کی (۳) باپ کی دعا لڑکے کے حق میں۔ (ابوداؤد۔ترمذی)

خوف وخطر لاحق ہو تو کیا کہنا چاہئے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کسی قوم سے خطرہ لاحق ہوتا تو آپ فرماتے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ.

اے اللہ ہم ان کو تیرے سامنے کئے دیتے ہیں۔ اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

منزل پر پہنچ کر

حضرت خولہؓ بنت حکیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی منزل پر اُترتے ہوئے یہ کلمات کہے۔

اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ. (مسلم)

میں اللہ کے کلماتِ کاملہ کے ساتھ اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اس نے پیدا کی۔ (جاری)

دین کا نبوی مزاج

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کے لیے محرک کیا چیز ہوتی ہے؟ نبی کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ اس لیے میں اس وقت آپ کے سامنے تین چیزیں عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ نبی کی دعوت، جدوجہد اور قول وعمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یہ وہ ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہوجائے، بس مجھے سب کچھ مل گیا۔ طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی امیدوں اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گزار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہ) آپ وہاں پہونچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداوں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کردیا اور انہوں نے پتھر پھینکنے شروع کیے اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہوگئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے اور کیا ہوا، یہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں، اسی حالت میں آپ نے یہ دعا فرمائی، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے، آپ نے فرمایا: "**اللھم إليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس، رب المستضعفين، إلى من تكلني إلى بعيد يتجهمني او إلى عدو ملكته امري**" میں اس کا ترجمہ کردیتا ہوں، فرماتے ہیں کہ اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں اپنی کمزوری کا اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی، بے بسی وبے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالے کرتا ہے، کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میرے زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معا فرماتے ہیں: **إن لم يكن بك على غضب فلا ابالي غير ان عافيتك هي اوسع لي**" (اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ انسان ہوں، تیری عافیت کا طالب ہوں) تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیاد ہوتی ہے، وہ رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہنچاتے ہیں اور جب ان کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہنچادیا، اور ہمارا رب ہم سے راضی ہوگیا تو پھر ان کو بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے ﴿**لبث فيهم الف سنة الا خمسين عاما**﴾ پچاس پر کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے اور انہوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کردیئے، سورہ نوح کی آیات پڑھئے: ﴿**قال رب انى دعوت قومى ليلا ونهارا**﴾ پھر میں نے انہیں علانیہ بھی کہا اور مخفی طور پر بھی کہا۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ

﴿**وما آمن معه الا قليل**﴾ ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، لیکن ان کو اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا وہ میں نے کردیا، میں نے اپنے رب کو راضی کردیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ دین کے ہر عمل کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اس رضائے الٰہی کے سلسلہ میں اگر ساری سلطنت ہمارے ہاتھ سے نکلتی ہو تو وہ سلطنت نکلی نہیں بلکہ آئی اور رضائے الٰہی کے بغیر ہفت اقلیم کی سلطنت ملتی ہو تو وہ سلطنت ملی نہیں بلکہ کھوئی، اس لیے میں حضرت حسینؓ کے کارنامہ کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، اور میں ان کو بالکل ناکام نہیں سمجھتا، انہوں نے ایک نظیر قائم کردی کہ حق کے لیے کس طرح سینہ سپر ہوا جاتا ہے، کس طرح جان دی جاتی ہے، انہوں نے اس کی نظیر قائم کردی کہ کسی غلط چیز کے خلاف (خواہ اس پر کوئی لیبل لگا ہو) اگر آدمی جدوجہد کرے تو اس کا جواز ہے، اگر حضرت حسینؓ کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو بعد میں بڑی مشکل پیش آتی، کہیں کھلے طریقہ پر دین کو پامال کیا جارہا ہے، یا اسلام کشی، اسلام دشمنی کی جارہی ہے، یا دین میں بالکل تحریف کی جارہی ہے، لیکن اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی جاسکتی کہ عہد سعادت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

فرق تو بہت بڑا ہے تاریخ کا بھی بڑا فاصلہ ہے، اور شخصیت کا بھی بڑا فرق ہے، لیکن یہی معاملہ شہدائے بالاکوٹ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ہے کہ آج چپۂ ارض پر ان کی یا ان کی جماعت کی حکومت نہیں، اور خدا کا شکر ہے اور اس میں اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں، میرا بھی ان کے خاندان سے تعلق ہے، الحمدللہ ہم نے ان کے کام اور ان کے نام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، ہمارے خاندان کے افراد ملازمتیں کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں عام مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں نہ کوئی سجادگی ہے، نہ کوئی مجاوری اور نہ یہ کہ انہوں نے جو ریاست بنائی تھی اس سے فائدہ اٹھارہے ہیں لیکن ہم خوش اور مطمئن ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا اور خدا کے سامنے سرخرو ہیں:

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ سربلندی اور اقتدار حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ: ﴿**تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فى الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين**﴾ (القصص:۸۳) یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کریں گے، جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں اور اچھا انجام متقین کے لئے ہے۔"

لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے: ﴿**ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين**﴾ (آل عمران:۱۳۹) "ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تمہیں اعلیٰ ہو تمہیں کو علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو۔"

اب دونوں میں تطبیق کس طرح دین گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علو مت چاہو، ہم علو دیں گے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا اور تواضع اور ایثار وقربانی سے کام لیا، اللہ تعالیٰ کو جتنا منظور تھا، ان کو علو عطا فرمایا، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلف کے اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہوجاتا ہے، قرآن شریف میں اسی مضمون کو اس طرح سے ادا کیا گیا ہے: ﴿**يوم لا ينفع مال ولا بنون، إلا من اتى الله بقلب سليم**﴾ (الشعراء:۷۹-۸۹)

جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا) اس میں غیر اللہ کے مقابلہ میں کوئی اور محرک، کوئی اور طاقت، کوئی اور خواہش نہ ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے: ﴿إذا جاء ربه بقلب سليم﴾ (الصّٰفّٰت:۸۴) جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ جاری رہنی چاہئے اور برابر اپنے قلب کا احتساب جاری رہنا چاہئے کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادی مفادات، علو اور سر بلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے۔

اقبال نے صحیح کہا ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینوں میں چھپ چھپ کے بنا لیتی ہے تصویریں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان الشيطان يجري من المومن مجرى الدم" شیطان مومن کے جسم میں بعض اوقات اس طرح سرایت کر جاتا ہے، جس طرح خون رگوں میں دوڑ جاتا ہے، حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی دعوت یہی قلب سلیم کی دعوت تھی، تزکیہ واحسان کا لب لباب اور اللہ کے مخلص بندے جو نفوس اور قلوب کا علاج کرتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ قلب سلیم پیدا ہو جاتے تھے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے قلب سلیم کے حامل ہو جائیں ان کے اندر سے دنیا کی محبت، مال کی محبت، جاہ کی محبت اور اولاد کی وہ محبت (جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں مزاحم ہو) نکل جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء (اور نائبین انبیاء) دین کی تعلیم اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے بارے میں بڑے غیور ہوتے ہیں، وہ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرتے، وہ اس کو جوں کا توں، بے کم وکاست پہنچاتے ہیں نہ کوئی (ذہنی) رشوت قبول کرتے ہیں، اور نہ کوئی رشوت دیتے ہیں، کوئی مانے نہ مانے، کوئی ان کی طرف آئے یا نہ آئے، وہ اپنی بات اسی انداز میں کہتے ہیں، جس انداز میں خدا نے ان کو وہ بات عطا کی اور سمجھائی ہے، مثلاً ایسا ہوا کہ کفار نے مسلمانوں سے کہا کہ کچھ دن تم ہمارے بتوں کی عبادت کر لو اور کچھ دن ہم تمہارے بتوں کی، خدا کے پیغمبر نے جواب دیا ہرگز نہیں: ﴿لا اعبد ما تعبدون، ولا انتم عابدون ما اعبد﴾ (الکافرون: ۲-۳) نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔"

طائف کے قبیلہ ثقیف نے چاہا تھا، کہ "لات" کو جو قبیلہ بنی ثقیف کا بڑا بت تھا، گویا قریش کے بت "ہبل" کا ہمسر تھا، نہ توڑا جائے اور اس کی کچھ عرصہ تک عبادت کرنے کی اجازت دی جائے، انہوں نے کہا کہ ایک سال! فرمایا ہرگز نہیں، ایک دن! ہرگز نہیں اور اس کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا، انہوں نے جا کر اس کو پاش پاش کر دیا، انہوں نے کہا کہ ہم دین میں داخل ہوتے ہیں، لیکن نماز سے ہم کو معاف کر دیا جائے، فرمایا: "لا خير في دين لا ركوع فيه" ایسے دین میں کچھ رکھا نہیں جس میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو۔"

تو ایک بات تو یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا سمجھوتہ (Compromise) نہیں کرتے، وہی زبان، وہی الفاظ بولتے ہیں، جو ان کے پیغام اور کار رسالت سے مناسبت رکھتے ہیں، آخرت کی صاف صاف دعوت دیتے ہیں، جنت ودوزخ کو پیش کرتے ہیں، ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے زمانہ میں بھی مختلف فلسفے ہوتے ہیں، ان کے زمانہ میں بھی مختلف گروہوں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ اس سے ناواقف نہیں ہوتے، ان کے زمانہ کے بھی رائج الوقت سکے ہوتے ہیں، وہ ایسا ایک سکہ بھی استعمال نہیں کرتے، صاف بات کہتے ہیں، اللہ پر ایمان لاؤ، اس کی صفات پر، اس کے افعال پر ایمان لاؤ، اس کے ملائکہ پر ایمان لاؤ، تقدیر پر ایمان لاؤ، حشر نشر، حیات بعد الموت پر ایمان لاؤ، اگر ایسا کرو گے، تو تمہیں جنت ملے گی، ایک مرتبہ بھی نہیں کہتے کہ تمہیں حکومت ملے گی، ہمیشہ یہ کہتے

ہیں جنت ملے گی، خدا کی رضا ملے گی، خدا تم سے راضی ہوگا، قرآن وحدیث میں مجھے کہیں نہیں ملتا کہ دین کی دعوت قبول کرنے سے تم کو دنیا میں علو اقتدار حاصل ہوگا، اگر کہیں حکومت اور امن وحفاظت کا وعدہ فرمایا ہے تو اس کا انداز یہ ہے۔

"اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے، جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ انہیں ضرور ملک کی حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی اور ان کے لیے جس دین کو پسند کیا ہے اسے ضرور مستحکم کر دے گا اور البتہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔" (النور:۵۵)

دوسری جگہ فرمایا ہے: "وہ لوگ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔"

یعنی یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے، اس کے راستہ سے حکومت الٰہی تک نہیں پہنچنا ہے، بلکہ حکومت الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھنا ہے، اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا، پھر ان کو رائج کرنا، خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے مقاصد، مبادی وحقائق کے بارے میں حد درجہ کے غیور، بلکہ ذکی الحس ہوتے ہیں، اور اس میں ذرا سی بھی تبدیلی وتحریف گوارہ نہیں کرتے۔ جب مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ کی پوری نصرت کریں گے تو ہمیں کیا ملے گا کیا؟ آپ کے لیے بڑا آسان تھا (اور اس کے قرائن موجود تھے) کہ آپ کہتے ارے بھائی ہم آجائیں گے اور تم ہمارے ساتھ مل جاؤ گے تو بادشاہت قائم کر لیں گے، ایک اسٹیٹ بن جائے گی، اس لیے کہ تم منتشر ہو، ہماری وجہ سے وحدت پیدا ہو جائے گی، تم کمزور ہو، طاقت آئے گی، لیکن اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

تو ایک بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دین کو اسی طرح پہنچاتے ہیں، انہیں اصطلاحات کے ساتھ پہنچاتے ہیں، جو پیغمبروں کی دعوت اور آسمانی کتابوں میں آئے ہیں، بلکہ الفاظ تک کا تحفظ کرتے ہے، اور دین کی تعبیر ایسی کرتے کہ جس سے یہ خیال ہو کہ بہت سے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں، بہت ذہین ہیں کھینچ کر چلے آئیں گے، بالکل جیسی چیز ان کو ملتی ہے ویسی ہی چیز ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں، لیکن حکمت کے ساتھ، ان کا عمل اس آیت پر ہوتا ہے ﴿ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة﴾ (النحل:۱۲۵)

"اپنے رب کے راستہ کی طرف دانش مندی اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ۔"

لیکن اس میں خطرہ مول نہیں لیتے کہ ذہن ایک دوسری رخ پر چلا جائے، یہ نبوی مزاج ہے، اور یہ دین جو اس وقت تک محفوظ رہا ہے وہ خدا کے فضل کے بعد اسی وجہ سے ہے کہ امت کے ہر دور میں علمائے ربانی اس کی حفاظت کرتے رہے، انہوں نے اس کی روح کی بھی حفاظت کی، مراتب کی بھی حفاظت کی کہ دین میں جس حکم، جس رکن کا جو مقام ہے وہ باقی رہے، جو چیز جس مقام کی ہے وہیں رکھی جائے، عبادت عبادت ہے، فرائض فرائض ہیں، ارکان ارکان ہیں، ایمانیات ایمانیات ہیں، آخرت آخرت ہے، انہوں نے دنیا کو آخرت پر غالب ہونے نہیں دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج امت میں بے عملی تو ہے، ہم سب بھی خطا کار اور کمزور مسلمان ہیں لیکن یہ دین محفوظ ہے، آج تک دین میں تحریف نہیں ہو سکی، اس کے برخلاف عیسائی کلیسا کے ذمہ داروں اور بائبل کے شارحین نے اپنے زمانہ کے بعض جدید نظریات بائبل میں شامل کر لیے، بائبل میں شامل نہ ہو سکے تو اس کی شرح اور اس کی تفسیر میں ان کو شامل کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ نظریہ بدلا تو بائبل بھی متزلزل ومشکوک اور ساقط الاعتبار ہو گئی، بائبل کی تفسیر میں انہوں نے لکھ دیا کہ زمین چپٹی ہے اس لیے کہ اگر چپٹی

بقیہ صفحہ 34 پر

کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیر

مولانا سید عزیز الرحمٰن

زبان وبیان

زبان وبیان قدرت کا عطیہ ہے، قرآن حکیم نے نطق لسانی اور ذوق بیانی کو اللہ تعالیٰ کی ایک اہم اور عظیم نعمت قرار دیا ہے اور اس کی اس حیثیت کو کئی مقامات پر بیان کیا ہے، سورہ رحمٰن میں فرمایا: ﴿الرحمن، علم القرآن، خلق الانسان، علمه البيان﴾ رحمٰن نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اور اس کو بیان عطا کیا۔

حضرت حسن بصریؒ کی تصریح وتفسیر کے مطابق یہاں بیان سے مراد نطق اور گویائی ہے اور درحقیقت اسی نعمت کی بنا پر انسان کو جملہ مخلوق پر فوقیت حاصل ہوئی اور وہ اشرف المخلوقات کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوا، کیوں کہ عقل وشعور اور نطق وبیان کی عظیم نعمت کی تکمیل درحقیقت قرطاس وقلم کی محتاج تھی، جب کہ دولت علم کا عطیہ در اصل عقل وشعور کی تربیت اور نطق وبیان کو رعنائی بخشنے کے لیے تھا، انسانیت کے لیے خلاق ازل کا یہ عطیہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اگر انسان کو اس کے ظرف کے مطابق علم کی دولت میسر نہ آئے تو اس کی شخصیت میں نہ تو اعتدال وتوازن پیدا ہوسکتا ہے۔ نہ اس کے نطق بیان کی صلاحیت کو جلا مل سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ افصح العرب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب شرف نبوت سے نوازا گیا تو قرآن حکیم میں تخلیق انسانی کے مختلف مدارج کا ذکر کرکے اس احسان خداوندی کی یاددہانی کے ساتھ ساتھ دولت علم اور قرطاس وقلم کی عظمت کا بھی اعلان ہوا۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿اقراء باسم ربك الذى خلق، خلق الانسان من علق، اقراء وربك الاكرم الذى علم بالقلم، علم الانسان مالم يعلم﴾

اپنے اس رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے تخلیق کیا، پڑھ کہ تیرا رب تو سب سے زیادہ بزرگی والا ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھایا، جو وہ نہیں جانتا تھا۔

امام ادب جاحظ زبان کے اوصاف اور اس کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ”زبان ایک آلہ ہے، جس سے اظہار بیان کا کام لیا جاتا ہے، وہ ایک شاہد ہے، جس سے مافی الضمیر کی تعبیر کی جاتی ہے، وہ ایسا حاکم ہے، جو خطاب کی صفائی کا حامل ہے، ایک ناطق ہے، جس کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے، ایک سفارش کنندہ ہے، جس کے سہارے حاجت روائی کی جاتی ہے، ایسا وصاف ہے، جس سے اشیاء کا تعارف حاصل ہوتا ہے، وہ ایک واعظ ہے، جو منکرات وقبائح سے روکتا ہے، یہ زبان غموں کو دور کرکے تسلی دینے والی ہے، معذرت کرکے کینہ ختم کرتی ہے، محبت کا بیج بوتی اور عداوت کی بیخ کنی کرتی ہے، شکر گزاری کرکے اضافہ نعمت کا باعث بنتی ہے اور تعریف کرکے ممدوح کے قرب کی مستحق ہوجاتی ہے نیز وہ ایک مونس ہے، جو وحشت کو دور کرتی ہے۔“

فصاحت وبلاغت اور ذوق بیان وقوت تکلم کو اہل عرب کے ہاں ہمیشہ سے نہایت اہمیت حاصل رہی ہے۔ سہل بن ہارون بیان یعنی فصاحت وبلاغت سے پر کلام اور قوت تکمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: **العقل رائد الروح والعلم رائد العقل، والبيان ترجمان العلم.**

عقل روح کو ہنکاتی ہے اور علم عقل کی راہنمائی کرتی ہے اور بیان علم کا ترجمان ہے۔

نیز وہ اہل عرب کا قول نقل کرتا ہے: **"حيلة المروة الصدق وحياة الروح العفاف، وحياة الحلم العلم، وحياة العلم البيان."**

مروت کی زندگی سچائی سے ہے، روح کی حیات پاک دامنی سے اور حلم کی زندگی علم سے ہے اور علم کی حیات بیان (قوت تکمل) سے وابستہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خطابت کے لیے بھی جو کہ نطق وبیان کے ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے فصاحت وبلاغت بنیادی شرط ہے۔ ابو داؤد بن صریز کہتا ہے: **"راس الخطابة الطبع، عمودها الدربة، وجناحاها رواية الكلام، وحليها الاعراب، وبهائوها تخير الالفاظ، والمحبة مقرونة بقلة الاستكراه."**

عربی زبان

عربی زبان مسلمانوں کی سرکاری زبان قرار دی جاسکتی ہے، اس لیے کہ یہ ان کی دینی وعلمی زبان ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کی جانب مسلمانوں کو خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے: **"احبو العرب لثلاث، لانى عربى، والقرآن عربى، كلام اهل الجنة عربى"**

عرب سے تین وجوہ سے محبت کرو، میں عرب ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہوگی۔

دوسری روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"اذا سالتم الحوائج فاسئلوا العرب، فانها تعطى لثلاث خصال، كرم باحسابها، واستحياء بعضها من بعض والمواساة لله، ثم قال: من ابغض العرب البغضه الله."**

ترجمہ: جب تم کسی سے سوال کرنا چاہو تو تم عرب ہی سے سوال کرو، کیونکہ تین خصلتوں کی وجہ سے وہ تمہیں ضرور دے گا۔ ایک شرافت حسب ونسب کی وجہ سے، دوسرے آپس میں ایک دوسرے سے حیا کرتے ہوئے اور تیسرے اللہ کی راہ میں خیر خواہی کے جذبے سے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو عرب سے بغض رکھتا ہے اللہ اس کو ناپسند کرتا ہے۔“

عربی زبان قرآن کی زبان ہے اور قرآن حکیم نے اسے عربی مبین یعنی ظاہر واضح اور کھول کر بیان کرنے والی زبان قرار دیا ہے، یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن کریم قریش کی زبان میں ان کی لغت کے مطابق نازل ہوا۔

عربی زبان کو قدرت نے بے شمار لفظی ومعنوی محاسن وفضائل سے نوازا ہے، اگر ہم اس زبان کی صوتی ومعنوی ہم آہنگی پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ زبان ہر معنی کے لیے ایک خاص آواز رکھتی ہے۔ اس میں حروف کی حرکت وتکرار ایک مخصوص معنی کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ حروف کی قلت وکثرت معنی میں کمی بیشی کا سبب ہوتی ہے۔ پھر مختلف اوزان اور ان کے مطابق مادے سے مشتقات کا ایک معین معنی کے لئے مخصوص ہونا اس امر کی بین شہادت ہے کہ یہ زبان انتہائی سائنٹفک، مرتب اور با اصول وبا قاعدہ ہے۔ اس زبان کے قواعد واصول کا گہرا مطالعہ اس زبان کے مختصر وجامع ہونے کی بین شہادتیں پیش کرتا ہے اور ان تمام امور پر غور وخوض سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آخری ضابطہ حیات عربی زبان ہی میں کیوں بھیجا گیا۔

یہاں یہ سوال بھی اہمیت رکھتا ہے کہ عربی مبین سے کون سی زبان یا عربی کا کون سا لہجہ واسلوب مراد ہے؟ سو اس حوالے سے حضرت بریدہؓ سے منقول ہے کہ لسان عربی مبین سے مراد لسان جرہم ہے۔ جرہم قریش کے ننہال مورث اول کا نام ہے، جس کے خاندان میں حضرت اسماعیل نے شادی کی تھی۔ اسی طرح یاقوت ہشام کلبی کی روایت سے لکھا ہے: **"واللسان السادس من انطقه الله فى عربة بلسان لم يكن قبلهم اسماعيل بن**

ابراھیم نطقوا بالمبین، وھو السادس ممن تکلم بالعربیۃ ھو وبنوہ ولسانھم المبین، وکتابھم المبین، وھو الغالب العرب الیوم"

حضرت اسماعیل کو بلوائی، بنو اسماعیل میں زبان بولے اور یہ چھٹے بزرگ ہیں، جو عربی میں بولے، ان کی زبان اور تحریر مبین ہے۔ اور یہی زبان آج تمام عرب کی زبانوں پر غالب ہے۔ ہمارے سامنے موجود عرب سرمایہ ادب اس کے باوجود کہ وہ اصل سرمائے کا شاید نصف بھی نہیں ہے اور زیادہ تر حصہ امتداد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے بہت سی وجوہ سے بڑی وسعت اور کافی اہمیت کا حامل ہے۔

عرب اور عربی

اہل عرب کا ایک اختصاصی تعارف یہ تھا کہ وہ لکھنے پڑھنے والی قوم نہ تھی، یعنی وہ امی تھے، کتابی علوم سے نا آشنا اور قلم وقرطاس سے بالکل نابلند، بلکہ تیسری صدی ہجری کے ایک معروف مورخ بلاذری کے بقول تو پورے قریش میں آغاز اسلام میں صرف سترہ افراد ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اگر چہ بلاذری کا بیان مکمل طور پر درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا، موضوع کے استقصا اور کتب تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی قریش کی چار ہزار کی لگ بھگ آبادی میں ۲۹، ۳۰ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے، مگر اس سے اصل موضوع پر اثر نہیں پڑتا، لکھنے پڑھنے کا رجحان نہ ہونے کی بات بہر حال ثابت شدہ حقیقت ہے، اس بنا پر ابلاغ اور پیغام رسانی کے لیے عربوں نے بھی خطابت ہی کا سہارا لیا اور اسے ایک موثر ذریعے کے طور پر اختیار کیا، ان کے پاس کچھ کتابی شکل میں محفوظ نہ تھا، جو کچھ تھا وہ یہی سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات، دیدہ وروں کے مشاہدے اور صاحبان حکمت کے تجربات، جنہیں وہ شعر وخطابت کے ذریعے آگے پہنچاتے رہتے تھے، اس بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ جب اسلام آیا اس وقت ابلاغ کی دو ہی صورتیں رائج تھیں یعنی خطابت وشعر تو یہ بات بالکل درست ہوگی، اس وقت اصل ذمے داری قاصد ہی کی ہوتی تھی اور وہ بزور خطابت اپنا پیغام پہنچایا کرتا تھا، اس دور میں قاصد "ناقل" نہیں "قائل" ہوتا تھا، بعد میں بھی جب فن کتابت عربوں میں عام ہوگیا، عربوں نے کتاب سیکھ لی اور خطوط کا تبادلہ ایک معمول بن گیا تب بھی یہ روایت برقرار رہی اور اس وقت بھی قاصد میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ وہ فصیح اللسان ہو، تاکہ مافی الضمیر کو عمدہ اسلوب میں دوسروں تک پہنچا سکے، کیونکہ وہ عرب تھے، اور والعربی ذو بدیھۃ وذو بیان اور عربی فی البدیہ گفتگو کرنے والا اور صاحب بیان ہوتا ہے۔

عرب اپنی فصاحت وبلاغت پر اس حد تک نازاں تھے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے، اور ان کا معیار فضیلت ہی فصاحت وبلاغت تھا اور بقول جاحظ: "لان العرب اشد فخرا ببیانھا وطول السنتھا وتصریف کلامھا وشدۃ اقتدارھا، وعلی حسب ذالک کانت زرایتھا علی کل من قصر عن ذالک التمام، ونقص من ذالک الکمال۔"

کیونکہ عرب اپنے بیان، زبان دانی اور قدرت کلام پر سب سے زیادہ فخر کرتے تھے، یہی سبب ہے کہ اگر کوئی شخص اس خوبی سے قاصر ہوتا یا اس فن میں ناقص ہوتا تو وہ اسے حقیر تصور کرتے تھے۔ حسن بیان اور بلاغت کلام سے محرومی کو اہل عرب کے ہاں ایک عیب اور قابل ملامت عیب تصور کیا جاتا تھا، ایک شاعر کہتا ہے:

کفی بالمرء عیبا ان تری لہ
وجہ ولیس لہ لسان
وما حسن الرجال لھم بزین
وذالم یسعد الحسن البیان

انسان کے عیب دار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اگر تم اسے دیکھو تو تمہیں اس کا چہرہ تو نظر آئے، مگر وہ زبان کے بغیر ہو۔

مردانہ حسن اس وقت تک باعث زیبت نہیں بن سکتا، جب تک اس کی تائید حسن بیان سے نہ ہوتی ہو۔

جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے

مصر فتح کیا اور حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع کرنی چاہی تو حضرت معاویہ بن خدیج کو منتخب کیا، انہوں نے حضرت عمرو سے خط لکھنے کی درخواست کی تو فرمایا کہ کیا تم عرب نہیں ہو، کیا اپنا مشاہدہ بیان نہیں کر سکتے، کیا اپنی بات بیان کرنے پر تم قدرت نہیں رکھتے۔

جب جلولاء کے مقام پر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو امیر لشکر ہاشم بن عتبہ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو خوش خبری دینے کے لیے مال غنیمت خمس وغیرہ لے جانے والے قافلے میں چند آدمی ساتھ کیے، جن میں زیاد بن ابیہ جیسا خطیب بھی تھا۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس پہونچے تو ان کے انداز بیان نے حضرت عمر کو متاثر کیا اور انہیں یہ انداز پسند آیا، ان کی خواہش ہوئی کہ عام مسلمانوں کو بھی اس واقعے کی اطلاع دی جائے، حضرت عمرؓ نے زیاد سے پوچھا کہ کیا یہ واقعہ عوام الناس کے سامنے بھی بیان کر سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں پھر انہوں نے عوام الناس کے سامنے پورا قصہ بیان کیا اور تفصیل سے بتایا کہ کیا قصہ پیش آیا کتنے افراد قتل ہوئے؟ کتنا مال غنیمت ہاتھ آیا اور کس طرح فتح حاصل ہوئی ان کا انداز اس قدر فصیح وبلیغ تھا کہ حضرت عمر بول پڑے کہ: ان ھذا لھو الخطیب المصقع بلاشبہ یہ ایک فصیح خطیب ہے۔

اسی طرح جب عبداللہ بن زبیرؓ افریقہ کو فتح کر کے حضرت عثمانؓ کے پاس پہونچے اور انہیں واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا، تو حضرت عثمان نے بھی ان کا انداز پسند کیا، اور ان سے کہا کہ کیا آپ لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان نہ کرنا پسند کریں گے؟ انہوں نے کہا اے امیر المومنین یہ بات میں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ پھر حضرت عثمان غنی کھڑے ہوئے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں افریقہ کی فتح نصیب فرمائی اور عبداللہ بن زبیر اس کی تفصیل آپ کے سامنے بیان کریں گے، پھر عبداللہ بن زبیر نے اپنا بیان شروع کیا اور جب خطاب ختم کیا تو ان کے والد حضرت زبیر اٹھے اور ان کی پیشانی چوم لی اور فرمایا کہ باکمال لوگوں کی اولاد بھی باکمال ہوتی ہے اور فرمایا کہ: "یا بنی ما زالت تنطق بلسان ابی بکر حتی صمت"

اے بیٹے! تم ابوبکر کی زبان میں بول رہے تھے۔

عجم اور عرب کے کلام کی خوبیوں اور اہل عرب کی کلام عجم پر برتری بیان کرتے ہوئے۔ حابظ لکھتا ہے:

"اہل فارس کا ہر کلام اور اہل عجم کا ہر معنی طویل غور وفکر، اجتہاد رائے، خلوت گزینی، مشورے اور معاونت، تفکر وتعمق اور طویل کتب بینی وکتب خوانی سے حاصل ہوتے ہیں، جس میں ایک کا دوسرے سے ربط ہوتا ہے اور ہر بات متعدد وجوہ سے آپس میں تعلق رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اس غور وفکر کے ثمرات مجتمع ہو کر سامنے آجاتے ہیں، لیکن اہل عرب کے پاس یہ سب کچھ بدیہی اور ارتجالا ہے، گویا کہ من جانب اللہ ایک الہام ہے اور ان کو نہ تو کسی سے مدد لینے کی ضرورت ہے نہ مشقت اٹھانے کی اور نہ غور وفکر واستعانت کی، انہیں صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ توجہ کلام کی جانب مبذول کریں، لڑائی، مقابلے، کشتی وغیرہ مواقع کو یاد کر کے راستے کی جانب اپنی توجہ رکھیں اور ان مقاصد کو اپنے سامنے رکھیں جن کا ارادہ کیا ہو، سو معانی از خود لشکروں کی صورت میں وارد ہوتے ہیں اور الفاظ خود بہ خود ہوٹ پھوٹ پڑتے ہیں۔

کلام نبوی کی خصوصیت

اہل عرب کے کلام کی یہ خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بھی موجود تھی، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی صورت میں لسان عربی مبین کو اپنا وہ عروج ملا، جس نے اسے دیگر تمام زبانوں پر ابدی اور دائمی فوقیت عطا کر دی۔ مصطفے صادق کے بقول: پختہ انداز ادا، شان فصاحت، حلاوت کلام اور اسلوب کی سلاست سمیت کوئی ایسی صفت نہ ہوگی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں طبعی وفطری طور پر موجود نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو ان کے لیے محنت ومشقت کی

تھی نہ ریاضت کی تکلیف اٹھائی تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر ان اوصاف میں کامل پیدا ہوئے تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر فصاحت کے مرتبے پر فائز تھے، مگر آپ کلام میں تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، نہ اسے منصوعی طور پر سجانے سنوارنے کا قصد فرماتے اور نہ تصنع کے طریقوں میں سے کسی طریقے کے متلاشی ہوتے، بلکہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرنا چاہتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے بالکل تجاوز نہیں کرتا تھا۔

ایک بار صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وما یمنعنی وانما انزل القرآن بلسانی، بلسان عربی مبین."

میری فصاحت میں کیا رکاوٹ ہوسکتی ہے، جب کہ قرآن میری زبان یعنی کھلی اور واضح عربی میں نازل ہوا۔ اور ایک روایت میں آپ نے فرمایا: "انا افصح العرب بید انی من قریش ونشات فی بنی سعد."

میں عرب کا فصیح ترین شخص ہوں کیوں کہ میں قریش میں پیدا ہوا اور میں نے بنی سعد میں پرورش پائی۔

اوران دونوں قبائل کی زبان دانی اور فصاحت لسانی مسلم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت وبلاغت میں صحرانشینی کی قوت بیان اور پختگی اور شہروں کے الفاظ چمک دمک اور انداز گفتگو کی رونق یہ چیزیں ایک ساتھ جمع ہوگئی تھیں، ان کے علاوہ تائید الٰہی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی جس کی امداد اس وحی کے ذریعے ہوتی تھی، جو انسان کے احاطہ عمل سے ماوراہے۔

اسی بناء پر علمائے فصاحت وبلاغت یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئے کہ کلام عرب میں سب سے فصیح کلام کلام ربانی یعنی قرآن حکیم ہے اور اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اور مقام ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔

محمد بن سلام نے یونس بن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ فصاحت وبلاغت کے جو اعلیٰ نمونے ہمیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے میسر آئے ہیں وہ کسی اور کلام سے میسر نہیں آسکے۔

کلام نبوی ﷺ کی تاثیر کے چند مظاہر

سادگی سے بھرپور فصاحت وبلاغت اور پوری انسانیت کی خیر خواہی سے لبریز خیالات اور ہر معاملے میں علم وعمل میں یکسانیت اور توافق کی بنا پر ہادی برحق، ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر تاثیر پیدا فرمادی تھی کہ جو کسی اور راہنما اور خطیب کے کلام کو نہیں حاصل ہوسکی۔ کلام نبوی علی صاحبہا السلام کی تاثیر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افصح العرب ہونے کی اضافی شہادت بھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہادی برحق ہونے کی بین روشن دلیل بھی، کتنی ہی بار ایسے مواقع پیش آئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے ادا ہونے والے چند جملوں نے فضا بدل ڈالی، جان لینے کی نیت سے آنے والے اپنی ہزار جانیں نچھاور کرنے پر آمادہ ہوگئے، سنگین سے سنگین صورت حال لمحوں میں تبدیل ہوگئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے منظر نامہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اس بنا پر قریش اور مشرکین مکہ علمۃ الناس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سننے سے منع کرتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو نہ سننے پائے۔

چنانچہ جب طفیل دوسیؓ جو قبیلہ دوس کے بڑے شاعر، ذہین اور سمجھ دار شخص تھے، مکہ آئے تو قریش نے انہیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈرایا اور ان سے کہا کہ ان کا کلام سحر کی مانند ہے وہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو آپ کا کلام نہ سنیں، کیونکہ جو شخص ان کا کلام سن لیتا ہے وہ انہیں کا ہو جاتا ہے، قریش کی باتوں

سے متاثر ہوکر حضرت طفیل دوسیؓ نے اپنے کانوں پر کپڑا ٹھونس لیا تاکہ وہ آپ کی آواز نہ سن سکیں۔

ایک روز اسی حال میں مسجد حرام کی طرف گئے تو دیکھا کہ آں حضرتؐ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں، طفیل دوسیؓ اگر چہ آپ کا کلام سننا نہیں چاہتے تھے لیکن دل میں یہ خیال آیا کہ میں خود اچھا شاعر ہوں اور کلام کے حسن وقبح سے واقف، اس لیے یہ کلام ضرور سننا چاہئے کہ اور اگر چہ اچھا اور بہتر ہو تو قبول بھی کرنا چاہئے۔، چنانچہ وہ آپؐ کے قریب پہونچ کر سننے لگے، آپ تھوڑی دیر میں نماز سے فارغ ہوکر گھر کی طرف روانہ ہوگئے، طفیل دوسیؓ بھی آپؐ کے پیچھے پیچھے چل دیئے جب آپ گھر پہنچے تو وہ بھی پیچھے پیچھے گھر پہنچ گئے اور آپؐ سے کہنے لگے کہ اے محمدؐ! آپ کی قوم نے مجھے اس قدر ڈرایا کہ میں نے اپنے کانوں میں کپڑا ٹھونس لیا کہ کہیں آپ کی آواز مبارک میرے کانوں میں نہ پڑ جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ میں آپ کا کلام سنوں، سو میں نے حسین وبھلا کلام سنا، سو میرے سامنے اپنی دعوت پیش کیجئے، آپؐ نے ان پر اسلام پیش کیا اور قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، طفیل دوسیؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! میں نے اس سے بہتر کلام آج تک نہیں سنا تھا اور نہ اسلام سے زیادہ معتدل دین کسی کا پایا، پھر وہ اسلام لائے، حق کی گواہی دی اور آپؐ سے اجازت لے کر اپنی قوم میں تشریف لے گئے اور ان کو دعوت اسلام دی، ان کی دعوت پر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔

حضرت ضماد ازدیؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی آپؐ کے معجزہ فصاحت وبلاغت کا ایک بڑا ثبوت ہے، ضماد ازدیؓ یمن کے باشندے تھے اور ان کا تعلق قبیلہ ازدشنوءۃ سے تھا، وہ جنون وغیرہ کا علاج کیا کرتے تھے، وہ ایک بار مکہ آئے تو انہوں نے اہل مکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں۔ (نعوذ باللہ) وہ یہ سن کر کہنے لگے کہ کیا خبر اللہ تعالیٰ ان کے جنون کا علاج میرے ہاتھ سے کرادے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور کہنے لگے کہ میں جنون کا علاج کرتا ہوں، اور اللہ نے بہت سوں کو میرے ذریعہ شفا دی ہے سو کیا آپ کا علاج کروں ان کی یہ گفتگو سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے یہ کلمات ارشاد فرمائے: "ان الحمد لله نحمده ونستعينه، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادی له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وان محمدا عبده ورسوله امابعد!

تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے ہم اسی کی حمد کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ ہی راستہ نہ دکھائے تو اس کی کوئی راہنمائی نہیں کرسکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، امابعد!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ضمادؓ کہہ اٹھے کہ یہ کلمات دوبارہ کہیئے، سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ان کے سامنے تین بار دہرائے، اس کے بعد وہ کہنے لگے کہ میں نے بہت سے کاہنوں، ساحروں اور شعراء کے کلام سنے ہیں لیکن ایسا (پراثر) کلام میں نے آج تک نہیں سنا۔ یہ کلمات تو اتھاہ سمندر کی مانند ہیں، اپنا دست مبارک بڑھایئے تاکہ میں اسلام پر بیعت کروں۔

یہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک کا اثر، ایک شخص جو بطور طبیب ومعالج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دامن رحمت سے وابستہ ہوگیا اور ایسا شخص جو خود سحر وجنون کا علاج کرتا تھا یہ کہہ کر کلام نبوت کی اثر انگیزی کا اعتراف کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہ شاعروں اور کاہنوں کی مانند ہے نہ ساحروں کی طرح ہے۔

□□□

اختلاف امت اوران کا حل

مفتی محمد شفیع

شیخ الہند مولانا محمد حسین صاحب قدس سرہ مالٹا کے چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے اہم بات ارشاد فرمائی:

جولوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید وبند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ وتعالیٰ کے لیے امت کی صلاح وفلاح کے گرد گھومتی تھیں، مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جوان کی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے۔ فرمایا:

''الحمدللہ! بمصیبتے گرفتارم بہ معصیتے۔

جیل کی تنہائی میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقا نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا: ''اس تکلیف کا کیا غم ہے جو اک دن ختم ہوجانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف ومحنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں۔''

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے اس وقت فرمایا کہ ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں؟..... یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاد العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟

فرمایا کہ میں نے جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

نباض امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی پیہم فرمائی، بذات خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔ اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے مگر اس واقعے کے بعد حضرت کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے:

آن قدح نہ شکست وآن ساقی نماند

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادثات وآفات سے دوچار ہیں، اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان میں سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا، غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قران کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

اختلاف رائے کی حدود

اختلاف رائے کچھ مذموم نہیں، اگر اپنی حدود کے اندر ہو۔ انسان کی فطرت

میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حکمت کے مطابق ایک مادہ غصہ اور مدافعت کا بھی رکھا ہے اور وہ انسان کی بقا وارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہ مادہ دشمن کی مدافعت کے لیے رکھا ہے، اگر اس کا رخ دوسری طرف ہوجائے، خواہ اس لیے کہ دشمن کو پہنچاننے اور متعین کرنے میں غلطی ہوگئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے۔

بہرحال جب دشمن کا رخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے مومن کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رخ متعین فرمادیا ہے: ﴿ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا﴾ ''شیطان تمہارا دشمن ہے اس کو ہمیشہ دشمن سمجھتے رہو۔''

جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کے غصے اور لڑائی کا مصرف صحیح صرف شیطان اور شیطانی طاقتیں ہیں۔ جب اس کی جنگ کا رخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہلاتی ہے، جو اعظم عبادت میں سے ہے، حدیث میں فرمایا ہے۔ **ذروۃ سنامہ الجہاد**۔ یعنی اسلام میں سب سے اعلیٰ کام جہاد ہے۔ لیکن اگر اس جنگ کا رخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے، جس سے بچانے ہی کے لیے اللہ کے سارے رسول اور کتابیں آئیں ہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ کانٹا جہاں سے یہ لائنیں بدلتی ہیں صرف یہ ہے کہ اس کا رخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ہے ورنہ فساد۔

دوقومی نظریہ جس نے پاکستان بنوایا اسی اجمال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمہ اسلام کے ماننے والے ایک متحد قوم ہیں اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ ان کے جہاد کا رخ اسطرف ہونا چاہئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی کہ قہر وغضب اور مدافعت کا مادہ، جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات ہوجاتی ہے۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پرنالوں کے ذریعہ نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

صلح اور جنگ کس سے؟

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ شیطان اور شیطانی تعلیم، کفر والحاد خدا اور رسول سے بغاوت، فاشی وعیاشی سے طبیعتیں مانوس ہورہی ہیں۔ ان کی نفرت دلوں سے نکل چکی ہے، اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا۔ انسانی رواداری، اخلاق، مروت کا سارا زور کفر والحاد اور ظلم کی حمایت میں صرف ہوتا ہے۔ نفرت، بغاوت، عداوت کا میدان خود اپنے اعضاء وجوارح کی طرف ہے۔ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا لڑائی ہے۔ چھوٹا سا نقطۂ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنادیا جاتا ہے۔ اخبارات ورسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے۔ دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہورہا ہے۔ دو متحارب طاقتیں لڑ رہی ہیں اور کوئی خدا کا بندہ اپنی طرف نظر کرکے نہیں دیکھتا کہ:

ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو

سیاست ممالک سے لے کر خاندانی اور گھریلو معاملات تک سب میں اسی کا مظاہرہ ہے جہاں دیکھو: انما المومنون اخوۃ کا سبق پڑھنے والے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ قرآن حکیم نے جہاں عفو درگزر، حلم وبردباری کی تلقین کی تھی وہاں جنگ ہورہی ہے اور جس محاذ پر جہاد کی دعوت دی تھی وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا ہے۔ **فالی اللہ المشتکی، وانا للہ وانا الیہ راجعون۔**

اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل بورڈوں کی نشست، حکومت کے عہدوں اور ملازمت کی دوڑ، صنعت وتجارت میں مقابلہ اور کمپیٹیشن، جائیدادوں اور زمینداروں کی کش مکش جہاں خالص اپنے حقوق کی جنگ

ہے جس کو چھوڑ کر بیٹھنا سب کے نزدیک ایثار اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہے، وہاں کوئی ایک انچ اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں۔ دین ومذہب کے نام پر کام کرنے والوں کی اول تو تعداد ہی کم ہے اور جو ہے وہ عموماً قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات سے اغماض کر کے جزوی اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ معرکہ جدال بنا ہوا ہے۔ جس کے پیچھے غیبت، جھوٹ، ایذائے مسلم، افترا وبہتان، تمسخر واستہزا جیسے متفق علیہ کبیرہ گناہوں کی بھی پروا نہیں کی جاتی۔ دین کے نام پر خدا کے گھروں میں جدال وقتال اور لڑائیاں ہیں، نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

اصلاح حال کی ایک غلط کوشش

ہمارے نو تعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے، تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں، جو دین ومذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے علاج سوچتے ہیں۔ وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو بھول جاتے ہیں، جو خالص نفسانی اور ذاتی غرض کے لیے لڑی جارہی ہیں۔ جن کے لیے ایک دوسرے کی جان، آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے، جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب امنڈتے ہیں مگر ان کو چوں کہ نئی تہذیب وشرافت کا نام دے دیا ہے اس لیے وہ قوم کے لیے کوئی مرض رہا نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف ولڑائی میں صرف ملا بدنام ہے اسی کا علاج زیر غور ہے، حالانکہ دین ومذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں، اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی صرف حدود سے تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ وہ کوئی برادری کا نوتہ نہیں بن سکتے، وہ اپنے ذاتی حقوق نہیں، جنہیں ایثار کیا جاسکے۔ بلکہ قرآن وسنت کی تعبیر کے اختلافات ہیں، جن کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد انہیں اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو ہٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترکہ مذہب بنالیا جائے، پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہو، تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہوجائے۔

مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً لیکن ہاں! خالص دینی معاملات جن میں جھگڑا نہ ذاتی حقوق ہی کا ہو، وہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کر کے ایسی صلح کی جاسکتی ہے۔ اس لیے باہمی جنگ وجدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلاف رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریئے کا پابند کردیا جائے۔

اختلاف رائے اور جھگڑے فساد میں فرق

اہل عقل وبصیرت پر مخفی نہیں کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں، جن میں آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔ ان میں اختلاف کرنا عقل ودیانت کا عین تقاضا ہوتا ہے۔ ان میں اتفاق صرف دو صورتوں سے ہوسکتا ہے۔ یا تو مجمع میں کوئی اہل بصیرت اور اہل رائے نہ ہو۔ ایک نے کچھ کہہ دیا سب نے مان لیا اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت ومروت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی بات پر صاد کردیا، ورنہ اگر عقل ودیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے اور یہ اختلاف کبھی کسی حال پر مضر بھی نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے لیے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسمبلیوں میں حزب اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن وسنت کے مجملات اور مبہمات کی تشریح وتعبیر میں اسی طرح کے اختلافات کو ''رحمت'' کہا گیا ہے۔ جو اسلام کے عہد اول سے صحابہ وتابعین اور پھر ائمہ مجتہدین میں چلے آئے ہیں۔ ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرام میں پیش آچکے ہیں، ان کو مٹانے کے معنی اس

کے سوا نہیں ہوسکتے کہ صحابہ کرام کی کسی ایک جماعت کو باطل قرار دیا جائے۔ جو نصوص حدیث اور ارشادات قران کے بالکل خلاف ہے اسی لیے حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف صحابہ کرام کے درمیان ہوچکا ہے اس کو بالکل ختم کردینا ممکن نہیں۔

صحابہ اور ائمہ مجتہدین کا طرز عمل

اسی کے ساتھ صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت جو ان میں اختلاف رائے پیش آیا ہے اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگ وجدال کی صورت اختیار کی ہو۔ باہمی اختلافی مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ سیاسی مسائل میں مشاجرات صحابہ کا فتنہ، تکوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آیا۔ آپس میں تلواریں بھی چل گئیں مگر عین اسی فتنہ کی ابتداء میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنیؓ باغیوں کے نرغے میں محصور تھے اور یہی باغی نمازوں میں امامت کراتے تھے تو امام مظلوم نے مسلمانوں کو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور عام ضابطہ بتایا کہ: "اذا هم احسنوا فاحسن معهم وان هم اسائوا فاجتنب اسلء تهم۔"

''یعنی جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور جب کوئی برا کام اور غلط کام کریں اس سے اجتناب کرو۔''

اس ہدایت کے ذریعے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو قرآنی ارشاد: ﴿وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ کی صحیح تفسیر بتادی اور باہمی انتشار اور افتراق کا دروازہ بند کردیا۔

اور اسی فتنے کے آخر میں جب کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان میدان جنگ گرم تھا۔ روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پاکر حضرت معاویہؓ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا، تو حضرت معاویہؓ کا جواب یہ تھا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکا نہ کھاؤ، اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رخ کیا تو علیؓ کے لشکر کا پہلا سپاہی جو تمہارے مقابلہ کے لئے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا۔

معلوم ہوا کہ باہمی اختلافات جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدد ارخ اختیار کرتے ہیں اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت اختلاف رائے جو صحابہؓ تابعین اور ائمہ مجتہدین میں رہا ہے تو بلا شبہ رحمت ہی ہے۔ اس کا کوئی پہلو نہ پہلے مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا اور نہ آج ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ انہیں حدود کے اندر رہے، جن میں ان حضرات نے رکھا ہے تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی معاملے پر نہ پڑتا تھا۔

جدال اور اصلاح

مذہب کے نام پر دوسرے اختلافات قرون اولیٰ کے بعد بدعت وسنت اور دوسری عنوانات سے پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے قرآن وسنت کی تعبیر میں اصول صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی آرا کو امام بنالیا اور نئے مسائل پیدا کردیئے۔ یہ اختلافات بلاشبہ وہ تفریق وافتراق تھے، جن سے قرآن وسنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید تھی مگر قرآن حکیم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتادیا ہے، جس کے ذریعے تفریق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے، بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ اصول دعوت الی الخیر ہیں، جن میں سب سے پہلے حکمت وتدبیر سے اور پھر خیر خواہی وہمدردی اور نرم عنوان سے لوگوں کو قرآن وسنت کے صحیح مفہوم کی طرف بلاتا ہے اور آخر میں مجادلة بالتي هي احسن یعنی حجت ودلیل کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوشش ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام اہل علم اور مصلحین نے ان اصول کو نظر انداز کردیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے مشغول ہوگئے کہ اپنے حریف کا استہزاء وتمسخر، اس کو زیر کرنے کے لئے جھوٹے سچے، ناجائز جائز ہر طرح کے حربے استعمال کرنا اختیار کرلیا، جس کا لازمی نتیجہ جنگ وجدل اور جھگڑا فساد تھا۔

اختلاف کی خرابیوں کا وقتی علاج

آج جب کہ مسلمانوں کا تفرق انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اپنی مزعومات کے خلاف کوئی کسی کی بات ماننے، بلکہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں اور کوئی ایسی قوت نہیں کہ کسی فریق کو مجبور کرسکے تو اس باہمی جنگ وجدال اور اس کے مہلک اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ فرقوں اور جماعتوں کے ذمے دار ذرا اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں کیا وہی اسلام کے بنیادی مسائل ہیں، جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ان کے لیے وقف کردی اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں یا بنیادی مسائل اور قرآن اور اسلام کا اصلی مطالبہ کچھ اور ہے؟ جس ملک میں ایک طرف عیسائی مشنریاں اپنی پوری قوت اور دنیاوی چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں، ایک طرف کھلے بندوں اللہ اور رسول اللہ ﷺ اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ایک طرف قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جارہا ہے، جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آیا تھا۔ اس جگہ صرف فروعی مسائل اور ان کی تحقیق وتنقید اور ترویج کی کوششوں میں الجھ کر ان بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ ورسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ دین پر یہ افتاد یں پڑ رہی تھیں، تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟

مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ، کوئی جماعت جب ذرا اپنے وقتی جھگڑوں سے بلند ہوکر اس کو سوچے تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی اور اس کی کوشش کا رخ بدلے گا۔ اس کے نتیجے میں باہمی آویزش یقیناً کم ہوگی۔ میں اس وقت کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے خیالات ومزعومات کو بدلے، گزارش صرف اتنی ہے کہ اپنی توانائی صرف کرنے کا صحیح محل تلاش کرکے اس پر لگادیں اور باہمی اختلافات کو صرف حلقہ درس یا فتویٰ یا تحقیقی رسائل تک محدود کردیں اور ان میں بھی لب ولہجہ قرآنی اصول دعوت کے مطابق نرم رکھیں۔ فقرے کسنے اور دوسرے کی توہین کرنے کو زہر سمجھیں۔

ہمارے پبلک جلسے، اخبار، اشتہار، بجائے باہمی آویزش کو ہوا دینے کے اسلام کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل پر لگ جائیں، تو پھر ہماری جنگ جو فساد کی صورت اختیار کرچکی ہے، دوبارہ جہاد میں تبدیل ہوجائے گی اور اس کے نتیجے میں عوام کا رخ بھی باہمی جنگ وجدل سے پھر کر دین کی صحیح خدمت کی طرف ہوجائے گا۔

صحیح اور غلط طرز عمل

بہت سے حضرات مسائل میں علماء کے اختلافات سے پریشان ہوکر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں؟ جس کی تہہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں۔ سب سے آزاد ہوکر جو سمجھ میں آئے کیا کریں اور بہ ظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق بجانب نظر آتا ہے، لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گردو پیش کے معاملات میں خود ہی مل جائے گا۔ ایک صاحب بیمار ہوئے، ڈاکٹروں یا حکیموں کی آراء میں تشخیص وتجویز کے باری میں اختلاف ہوگیا تو وہ کیا کرتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ ان ڈاکٹروں، حکیموں کی ڈگریاں معلوم کرکے یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہل تجربہ سے دریافت کرکے اپنے علاج کے لیے کسی ایک ڈاکٹر کو متعین کرلیتے ہیں۔ اسی کی تشخیص وتجویز پر عمل

کرتے ہیں مگر دوسرے ڈاکٹروں حکیموں کو برا بھلا کہتے نہیں پھرتے، یہاں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑو، اپنی آزاد رائے سے جو چاہو کرو۔ کیا یہی طرز عمل علماء کے اختلاف کے وقت اختیار نہیں کرسکتے؟

ایک مثال اور لیجئے آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے قانون جاننے والے وکلاء سے مشورہ کیا۔ ان میں اختلاف رائے ہوا تو کوئی آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ دے یا پھر کسی وکیل کی نہ سنے۔ خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں آئے کرے۔ بلکہ ہوتا یہی ہے مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کرلیتا ہے کہ ان میں سے کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابل اعتماد ہے اس کو اپنا وکیل بنالیتا ہے اور دوسرے وکلاء کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا، برا بھلا نہیں کہتا۔ اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔

یہی فطری اور سہل اصول اختلاف علماء کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو اگر آپ نے کسی غلط ڈاکٹر یا غیر معتمد وکیل پر اعتماد کرکے اپنا معاملہ اس کے حوالے کردیا تو اس کا جو نقصان پہونچتا ہے وہ آپ کو ضرور پہنچے گا مگر علماء کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔ حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔ شرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق وجستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے معالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں۔ اپنی مقدور بھر صحیح عالم کی تلاش وجستجو کرے آپ نے ان کے قول پر عمل کرلیا تو آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بری ہوگئے۔

اگر اس نے غلط بھی بتادیا تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ وہاں یہ نہ ہونا چاہئے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو اس کا ایم بی بی ایس ہونا بھی معلوم کریں اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں۔ مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے، کرتے اور داڑھی کو، یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنالیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں۔ اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔

باہمی جنگ وجدال کے دو رکن

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج مذہب کے نام پر جو جنگ وجدال کا بازار گرم ہے اس کے دو رکن ہیں۔ ایک ہر فرقہ اور جماعت کے علماء دوسرے وہ عوام جو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ علماء اگر اپنی تحقیق وتنقید میں قرآنی اصول دعوت کے مطابق دوسرے کی تنقیص وتوہین سے پرہیز کرنے لگیں اور اسلام کے وہ بنیادی مسائل جن میں کسی فرقے کو اختلاف نہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر جو مصائب آج آرہے ہیں وہ سب انہی مسائل سے متعلق ہیں۔ اپنی کوششوں اور محنتوں کا رخ اس طرف پھیر دیں۔

اسی طرح عوام اپنی مقدور بھر پوری کوشش کرکے صحیح عالم کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے رہیں۔ دوسری علماء یا ان کے ماننے والوں سے لڑتے نہ پھریں تو بتائیے کہ اس میں اشکال کیا ہے؟ سارے فرقے اور ان کے اختلافات بدستور رہتے ہوئے بھی یہ باہمی جنگ وجدل ختم ہوسکتا ہے، جس نے آج مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ صرف ذرا سی توجہ دینے اور دلانے اور طرز عمل بدلنے کی ضرورت ہے۔ کاش! میری یہ آواز ان بزرگوں اور دوستوں تک پہونچے جو اس راہ میں کچھ کام کرسکتے ہیں اور محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر اس ہمدردانہ دعوت کے لیے کھڑے ہوجائیں تو امت کی بہت سی مشکلات حل ہوجائیں اور ہمارا پورا معاشرہ جن مہلک خرابیوں کی غار میں جاچکا ہے ان سے نجات مل جائے۔

عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج

بقیہ صفحہ 32 پر

حضرت صدیق اکبرؓ

چند باتیں حیات سے

محترم عبدالواحد شاکر

ارشاد خداوندی ہے ﴿الذی یؤتی مالہ یتزکیٰ، وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ، الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ، ولسوف یرضیٰ﴾ (سورۃ اللیل:۲۱)

ترجمہ: جو اپنے مال کو پاک کرنے کیلئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے مگر صرف اپنے رب کی رضامندی کے لیے جو بلند و بالا ہے اور وہ عنقریب راضی ہوگا۔

اس بات پر تمام مفسرین کرام کا اجتماع ہے کہ یہ آیت کریمہ جناب صدیق اکبرؓ کی شان میں اتری ہے، اس لیے جناب صدیق اکبرؓ کا صحابی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے، اور جو اس کا انکار کرتا ہے تو گویا کہ اس نے قرآن پاک کا انکار کیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۲ برس ۳ ماہ اور گیارہ دن مزید زندہ رہے۔ اسی کے بارے میں حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدمہ آپ سے برداشت نہیں ہوا اور ہر روز نحیف و لاغر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آپؐ انتقال کر گئے۔

ابن شہاب فرماتے ہیں کہ آپؓ کے پاس ایک روز ہدیہ کا گوشت آیا تھا۔ آپ حارث بن کلدہؓ کے ساتھ اس کو تناول فرما رہے تھے کہ حارث نے کہا: ''اے امیر المؤمنین! آپ نہ کھائیں، مجھے اس میں زہر کی آمیزش کا اشتباہ ہو رہا ہے'' آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر اسی روز سے دونوں صاحب مضمحل رہنے لگے۔ ۷ر جمادی الثانی بروز پیر ۱۳ھ کو آپ نے غسل فرمایا تھا اور اسی روز سردی سے بخار ہو گیا اور پھر نہ سنبھلے۔ جب تک آپ کے جسم پاک میں توانائی حرکت موجود تھی، آپ مسجد نبویؐ میں تشریف لاتے رہتے اور نمازیں پڑھاتے رہے۔ لیکن جب مرض نے غلبہ پالیا تو آپ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر کہا کہ آئندہ آپ نمازیں پڑھائیں۔ جب طبیعت بہت زیادہ گرنے لگی تو آپ کو اپنے بعد امت کی خبر گیری کرنے والے کی فکر پیدا ہوئی۔ آپ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمان فتنۂ اختلاف سے امن میں رہ جائیں سب کی رائے یہ ہوئی کہ جن کو آپ مقرر کر دیں وہ منظور ہے۔ سب سے پہلے آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو بلا کر ان سے پوچھا کہ عمرؓ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

جواب دیا بخدا آپ کی نظر میں جوان کا مقام ہے، وہ میرے نزدیک اس سے زیادہ بھی افضل ہیں۔ ہاں ان کی طبیعت میں کسی قدر تشدد ضرور ہے آپؓ نے فرمایا کہ ان کی سختی اس لیے ہے کہ میں نرم ہوں لیکن جب ان پر ذمہ داری پڑ جائے گی تو خود بخود ان میں نرمی چھا جائے گی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ سے ان کے بارے میں پوچھا انہوں نے فرمایا کہ ان کا باطن ظاہر سے اچھا ہے اور ان کی مثل ہم میں کوئی نہیں۔ پھر آپؓ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور مدینہ میں یہ خبر اڑنے لگی کہ آپؓ حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپؓ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت نامہ لکھوا دیا وہ یہ ہے:

"بسم اللہ الرحمان الرحیم،

یہ ابوبکر بن قحافہ کی طرف سے وصیت نامہ ہے، جو اس نے آخری وقت دنیا میں جب کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر رہا ہے، اور شروع وقت آخرت میں جب کہ وہ عالم بالا میں داخل ہو رہا ہے، قلم بند کر رہا ہے یہ

ایسے وقت کی نصیحت ہے، کہ جس وقت کافر ایمان لے آتے ہیں، جھوٹ حق کی روبرو گردن جھکا دیتے ہیں میں نے اپنے بعد عمر بن خطابؓ کو تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے لہٰذا تم ان کا حکم سننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے اس معاملے میں خدا کی، رسول کی، اسلام کی، خود اپنی اور آپ لوگوں کی خدمت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور کوئی کوتاہی نہیں کی اب اگر عمرؓ عدل کریں گے تو ان کے بارے میں میرا علم اور حسن ظن یہی ہے اگر بدل جائیں تو ہر شخص اپنے کیے کا جواب دہ ہوگا میں نے جو کچھ کیا ہے وہ نیک نیتی سے کیا ہے مگر غیب کا علم اللہ کے ماسوا کسی کو نہیں اور جو ظلم کریں گے وہ اپنا انجام دیکھ لیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واقعتاً صدیق اکبرؓ کی ولایت وقبولیت کا یہ اعجاز تھا کہ اس قدر اہم و کٹھن اور پیچیدہ مسائل سہولت و خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ پچھلے اور پہلے مسلمانوں کا فتویٰ ہے کہ خلافت عمرؓ کا تقرر، حضرت صدیق اکبرؓ کا اسلام اور امت پر اس قدر احسان ہے کہ قیامت تک اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

آخری سانس میں ادائے فرض

آپ کی زندگی کا آخری دن تھا کہ حضرت مثنیٰ نائب سپہ سالار عراق آ پہنچے۔ اس وقت حضرت امیر المومنین جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے کہ مثنیٰ کی آمد معلوم ہوئی تو کسی خطرے کا احساس کر کے انہیں اسی وقت بلا بھیجا۔ انہوں نے محاذ جنگ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ حالات سن کر فوراً حضرت عمرؓ کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ عمر! جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو اور اس پر عمل کرو۔ مجھے امید ہے کہ میری زندگی اختتام کے آخری لمحات میں ہے۔ اگر دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے اور اگر رات کو نکلے تو صبح سے پہلے، مثنیٰ کے لئے کمک روانہ کر دینا۔ عمر! کسی بھی مصیبت کی وجہ سے دین اسلام کی خدمت اور حکم ربانی کی تکمیل کو کل پر ملتوی مت کرنا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑھ کر ہمارے لیے اور کون سی مصیبت ہو سکتی تھی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ اس روز بھی جو کچھ مجھے کرنا تھا میں نے کر ڈالا۔ خدا کی قسم! اگر میں اس روز حکم خداوندی کی تکمیل سے غافل ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ ہم پر تباہی کی سزا مقرر کر دیتا اور مدینہ کے گوشہ گوشہ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھتی۔ اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو شام میں کامیابی عطا فرمائے تو خالدؓ کی فوجوں کو عراق کے محاذ پر بھیج دینا اس لیے کہ وہ آزمودہ کار بھی ہیں اور وہاں کے حالات سے باخبر بھی۔

موت کی ساعت لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی حضرت عائشہؓ صدیقہ اپنے والد کے سرہانے بیٹھی تھیں اور آنسو بہا رہی تھیں غم آلود اور رنجیدہ خیالات آنسوؤں کے ساتھ دماغ کی پنہائی سے اتر کر زبان سے بہہ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ شعر پڑھا:

''بہت سی نورانی صورتیں ہیں کہ جن سے بادل بھی پانی مانگتے تھے، وہ یتیموں کے فریاد رس اور بیواؤں کے پشت پناہ تھے۔''

یہ شعر سن کر حضرت صدیق اکبرؓ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور فرمایا کہ بیٹی! یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس تھی، اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے دوسرا شعر پڑھا۔ (ترجمہ) قسم ہے تیری عمر کی جب موت کی بچکی لگ جاتی ہے تو پھر کوئی مال و دولت کام نہیں دیتا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بیٹی! اسی طرح مت کہو بلکہ یوں کہو:

﴿وجاءت سکرۃ الموت بالحق ذالک ما کنت منہ تحید﴾

(ترجمہ) موت کی بے ہوشی کا صحیح وقت آ گیا ہے کہ جس سے تم بھاگتے تھے۔

نبی رحمتؐ اور صدیق اکبرؓ کی مناسبت

۱..... حضرت محمد کی عمر مبارک تریسٹھ سال تھی تو صدیق اکبرؓ کی عمر مبارک بھی تریسٹھ سال تھی۔

۲..... آپ علیہ السلام کا انتقال پیر کے روز ہوا تو صدیق اکبر کا انتقال بھی پیر

کے روز ہوا۔

۳..... حضورؐ کی وفات سے پہلے پندرہ دن بخار ہوا تو صدیق اکبر کو بھی وفات سے پہلے صرف پندرہ دن بخار ہوا۔

۴..... حضورؐ کو سب سے پہلے سر میں درد اٹھا تو صدیق اکبرؓ کو بھی پہلے سر میں درد اٹھا۔

۵..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر یہودیوں نے دیا تھا تو صدیق اکبرؓ کو بھی زہر یہودیوں نے دیا تھا۔

۶..... آقا علیہ السلام کو زہر کھانے میں دیا گیا تھا تو صدیق اکبرؓ کو بھی زہر کھانے میں دیا گیا تھا۔

۷..... آقا علیہ السلام کے ساتھ جو صحابی کھانے میں شریک تھا وہ تو شہید ہوگیا تو صدیق اکبرؓ کے ساتھ جو صحابی رسول کھانے میں شریک تھا وہ بھی شہید ہوگیا۔

۸..... آقا علیہ السلام کے دونوں داماد عشرہ مبشرہ میں سے تھے تو صدیق اکبرؓ کے دونوں داماد بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

۹..... دونوں جہاں کے آقا کے نواسے حضرت حسینؓ کو شہید کرنے کے بعد ان کے سر کو کاٹا گیا تو صدیق اکبر کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شہید کرنے کے بعد ان کے سر کو بھی تن سے جدا کیا گیا۔

۱۰..... حضور علیہ السلام کے نواسے کو خلافت کے مسئلے پر شہید کیا گیا تو آقا مدنی کو اپنے کندھوں پر اٹھانے والے نواسے کو بھی خلافت کے مسئلے پر شہید کیا گیا۔

۱۱..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل مسواک مانگی اور آپ کی خدمت میں مسواک کو چبا کر حضرت عائشہؓ نے پیش کیا تو صدیق اکبرؓ نے بھی وفات سے قبل مسواک مانگی اور اس کو چبا کر حضرت عائشہؓ نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

۱۲..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" تھے تو آپ کے معراج کی گواہی دینے والے کے بھی آخری الفاظ "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" تھے۔

۱۳..... جس چارپائی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ لایا گیا اسی چارپائی پر صدیق اکبرؓ کا بھی جنازہ لایا گیا۔

۱۴..... جو چادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر ڈالی گئی تو وہی چادر آپؓ کے چہرے پر بھی ڈالی گئی۔

۱۵..... جس حجرے میں آقا علیہ السلام کی قبر مبارک بنی تو اسی حجرے میں جناب صدیق اکبرؓ کی بھی قبر بنی۔

انتقال

حضرت ابوبکرؓ کی پاک زندگی کا خاتمہ اس کلام پر ہوا-- **رب توفنی مسلما والحقنی بالصالحین** "اے اللہ مجھے مسلمان اٹھا اور نیک بندوں میں شامل کر جب روح اقدس نے پرواز کی تو ۲۲ر جمادی الثانی ۱۳ھ پیر کا دن، مغرب وعشاء کا درمیانی وقت اور عمر شریف ۶۳ برس تھی۔

آپ کو اپنی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا، حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے جسم پر پانی بہایا، حضرت عمر فاروقؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد کے ساتھ قبر شریف اس طرح کھودی گئی کہ آپ کا سر مبارک حضرت رحمۃ للعالمین کے دوش پاک کے ساتھ رہے اور دونوں قبروں کی تعویز برابر ہوجائیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، نے میت کو آغوش لحد میں اتارا اور وہ برگزیدہ شخصیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت مسلمہ کی سب سے زیادہ مقبول بزرگوار اور صالح شخصیت تھی، ہمیشہ کے لیے چشم جہاں سے اوجھل ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

●●●

"اردو"
کو فروغ دیجئے

یوری آونیری

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار

"یوری آونیری ایک اسرائیل یہودی دانشور اور صحافی ہیں۔ وہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ ذیل کے مضمون میں انہوں نے اسلام تلوار سے پھیلایا گیا، کے الزام کا بڑے دلچسپ انداز میں جواب دیا ہے۔ ان کے اس مضمون کی خاص اہمیت کی وجہ ایک یہودی کے قلم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع کے علاوہ یہ خاص بات ہے کہ عیسائی دنیا کو خصوصا کیتھولک پوپ کو ان کی ماضی کی تاریخ کا آئینہ دکھایا گیا ہے۔ یہ مضمون مغربی ذرائع ابلاغ میں شائع ہوا تھا، اب انٹرنیٹ پر اس ایڈریس پر پڑھا جاسکتا ہے:

www.gush-shalom.org

ایک زمانہ تھا کہ سلاطین روما عیسایوں کو "جرم مسیحیت" کی پاداش میں درندوں کے سامنے ڈلوا کر دلدوز مناظر سے تفریح طبع کا کام کیا کرتے تھے۔ اس وقت سے اب تک چرچ اور حکومتوں کے درمیان تعلقات نشیب وفراز کے مختلف مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔

۳۰۶ء میں یعنی آج سے ۱۷ صدی پہلے قسطنطین اعظم اپنی حدود سلطنت میں عیسائیت کو فروغ دیا۔ اس وقت فلسطین روما کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ اس تاریخی موڑ کے کئی صدیوں بعد چرچ دو حصوں میں کیتھولک اور مشرقی علاقوں کے آرتھوڈکس چرچ میں تقسیم ہوگیا۔ مغرب میں رومن چرچ کے بشپ نے جو اپنے آپ کو پوپ کہلاتا تھا، مطالبہ کیا کہ حکومت اس کی تابعداری قبول کرے۔

تاریخ گواہ ہے کہ سلاطین اور پوپوں کے درمیان کشمکش نے یورپ کے لوگوں میں تفریق پیدا کی ہے۔ ان کو بانٹ کر رکھا ہے۔ یورپ کی تاریخ کی تشکیل میں اس کشمکش کا مرکزی کردار رہا ہے۔ یہ داستان تاریخی نشیب وفراز سے گزرتی رہی ہے۔ کبھی بادشاہ پوپ کو نکال کر باہر کرتا اور کبھی پوپ بادشاہ کا حقہ پانی بند کردیتا یا اس کو معزول کردیتا۔ ایک بادشاہ تو بے چارہ مضحکہ خیز حد تک قابل ہمدردی رہا۔ ہنری چہارم کو کلیب تک ننگے پیر پیدل جانا پڑا، جہاں وہ پوپ کے قلعہ کے باہر، برف باری کے درمیان ننگے پاؤں عاجزی کرتا رہا تین دن کے بعد پوپ نے اس کا "حقہ پانی کھولنا" مناسب سمجھا۔

اس تاریخ میں ایسے دور بھی آتے رہے ہیں جب بادشاہت اور چرچ کے درمیان صلح وتعاون بھی ہوا، ہم اس وقت ایسے ہی ایک دور میں جی رہے ہیں۔ آج کے پوپ بینڈکٹ شانزدہم اور آج کے بادشاہ جارج بش دوم کے درمیان ایسی ایک عجیب وغریب اور شاندار ساز باز ہے۔ ایک طرف پوپ کا خطبہ ہے تو دوسری طرف تہذیبوں کے تصادم کے ماحول میں بش کی اسلامی فاشزم کے خلاف صلیبی جنگ بھی ہے۔

پوپ نے اپنے مشہور زمانہ لکچر میں دعویٰ کیا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام اور عیسائیت میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ عیسائیت عقل ومنطق پر مبنی ہے اور اسلام اس کا منکر ومخالف۔ عیسائی خدا کے کاموں کی حکمت ومعقولیت جانتے ہیں اور مسلمان اس کے منکر ہیں کہ اللہ کے افعال میں ایسی کوئی معقولیت پائی جاتی ہے۔

میں ایک لادین یہودی ہونے کی حیثیت سے اس غل غپاڑے میں پڑنا نہیں

چاہتا۔ یہ میری محدود صلاحیتوں کی بساط سے باہر ہے کہ پوپ کی اس منطق کو سمجھ سکوں، لیکن پوپ کے خطبہ کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے، جس کو میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ میں ایک یہودی ہوں اور تہذیبوں کے تصادم کے کارزار کے پاس ہی رہتا ہوں، یہ مجھ سے متعلق بھی ہے۔ اسلام کی عقل بیزاری کو ثابت کرنے کے لیے پوپ نے یہ بھی کہا کہ محمد صلی اللہ علی وسلم نے اپنے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے مذہب کو تلوار کی دھار سے پھیلائیں۔ پوپ کے نزدیک یہ مخالف عقل و منطق ہے۔ تلوار سے جسم مطیع ہو جاتا ہے روح و عقل نہیں جھکتے۔

پوپ نے اپنے دعوے کو مضبوط کرنے کے لیے سب کچھ چھوڑ کر ایک بازنطینی بادشاہ کے قول سے استدلال کیا ہے، جس کا تعلق ان کے حریف و مخالف مشرقی چرچ سے تھا۔ اس کی حکمرانی کا دور چودھویں صدی عیسائی کا آخری زمانہ تھا، شاہ مینویل دوم پیلیو لوگس کی طرف منسوب ہے۔ کہ اس نے ایک نامعلوم ایرانی مسلمان دانشور سے ایک گرما گرم بحث میں کہا: مجھے دکھاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا نئی بات کہی ہے، تم کو ان کے یہاں صرف بدی اور غیر انسانی چیزیں ملیں گی، مثلاً ان کا حکم کہ مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا جائے۔

یہاں تین سوالات اٹھتے ہیں: (۱) مینویل دوم نے یہ بات کیوں کہی؟ (۲) کیا اس نے واقعی ایسا کہا تھا؟ (۳) پوپ نے اس وقت کیوں نقل کیا؟ جس وقت مینویل دوم نے اپنی یہ تحریر لکھی تھی وہ اس وقت ایک دم توڑتی سلطنت کا سربراہ تھا، وہ ۱۳۹۱ میں تخت نشین ہوا، عظیم سلطنت روما کے صرف چند صوبے ہی اس وقت اس کے پاس بچے تھے اور اس بچے کھچے پر بھی ''عثمانی خطرہ'' منڈلا رہا تھا۔ عثمانی ترکوں نے نہر دانوابے کے ساحلوں تک اپنے پرچم لہرا دیئے تھے۔ بلغاریہ اور شمالی یونان ان کے زیر تسلط آچکے تھے۔ مشرقی رومن سلطنت کو بچانے کے لئے دوبار یورپ کی فوجیں آئیں، مگر عثمانی سیلاب کے آگے کوئی باندھ رکتا نہیں تھا۔ مینویل دوم کی موت کے بس چند برس بعد کی بات ہے کہ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) ترک گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج رہا تھا۔ یہ ٹاپیں ایک عظیم سلطنت کی زائد ہزار سالہ تاریخ کا اختتام کا اعلان تھیں۔

مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے عہد حکومت میں مینویل نے یورپ کی راجدھانیوں کے بڑے چکر کاٹے، اس نے چرچ کو ایک مرتبہ پھر متحد کرنے کا وعدہ کیا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس نے اپنی یہ مذہبی تحریر اس لیے لکھی ہوگی کہ وہ عیسائی ممالک کو عثمانی ترکوں کے خلاف بھڑکا کر اپنے دفاع کا سامان کرے، مقصد خود غرضانہ تھا، مذہب سیاست کے لئے استعمال کیا جارہا تھا۔

اس پس منظر میں یہ اقتباس جس لیے اس وقت لکھا گیا تھا، اسی مقصد کے تحت اس وقت نقل کیا گیا تھا، موجودہ دور کے بادشاہ بش کی مدد ہی اس کا اصل مقصد ہے، جو عیسائی دنیا کو ''بدی کے محور'' (مسلمانوں) کے خلاف متحد کرنے میں جی جان سے لگا ہوا ہے اور ہاں اس وقت (اگرچہ پرامن طور پر مگر ایک مرتبہ پھر) ترک یورپ کے دروازوں پر داخلے کے لیے دستک دے رہے ہیں۔

کیا مینویل کی بات میں سچائی کا کوئی حصہ ہے؟

خود پوپ کو اندازہ تھا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی پارہ ۳ کی ایک آیت میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

پھر قرآن کی ایسی صاف بات کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ پوپ کو لگا کہ اتنی صاف اور غیر مبہم آیت کے موجود ہوتے ہوئے ان کی بات مضحکہ خیز نہ بن جائے، اس لیے انہوں نے یہ تاویل کی کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کمزور تھے، بعد میں انہوں نے تلوار

کے زور سے تبلیغ کرنے اور لوگوں کو مسلمان بنانے کے احکام دیئے تھے۔

مگر! ذرا رکیے، قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے، ہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے مخالف قبائل، یہودیوں، عیسائیوں اور عرب کی دیگر جماعتوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا تھا، جب وہ اپنی ریاست قائم کررہے تھے، مگر اس کا مقصد بزور تلوار اسلام پھیلانا نہیں تھا۔

مسیح کہتے ہیں ''بیج اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے'' آیئے دیکھیں کہ اسلام کے بیج نے جو مسلمان پیدا کیے کیا انہوں نے تلوار کے زور سے اپنی مفتوح قوموں سے اسلام قبول کروایا؟ جب وہ طاقت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں تھے کہ وہ تلوار کے زور سے اپنی مرضی مسلط کرسکیں کیا اس وقت انہوں نے زبردستی اپنا مذہب پھیلایا؟

یقیناً اور بلاشبہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ اس جرم سے پاک ہے۔ مسلمانوں نے صدیوں یونان پر حکومت کی، کیا یونانی سب کے سب مسلمان ہوگئے، کیا کسی نے ان کو مسلمان بنانے کی کوشش بھی کی؟ بلکہ برخلاف یونانی عیسائیوں کو عثمانی حکومت نے بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا۔ بلغاریہ، ہنگری، سربیا، رومانیہ اور یورپ کی دوسری قومیں ترکوں کے زیر اقتدار رہیں، اور وہ اپنی عیسائیت پر برقرار رہیں۔ کسی نے ان کو اسلام پر مجبو کیا؟ اگر بوسنیا اور البانیہ کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو سب جانتے ہیں کہ یہ ان کا اپنا آزادانہ قومی انتخاب تھا۔

۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یروشلم فتح کیا اور اس کے مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کیا، اس سے پہلے فلسطین ۴۰۰ سال مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا۔ مگر اس کی اکثریت عیسائی باقی رہی۔ ان چار صدیوں میں ان پر اسلام مسلط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ صلیبیوں کے وہاں سے نکالے جانے کے بعد وہاں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا۔

اسی طرح کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں پر اسلام تھوپا گیا ہو، سب جانتے ہیں کہ مسلم اسپین میں یہودیوں کو جو عروج نصیب ہوا وہ تقریباً حالیہ دور تک ان کو کہیں حاصل نہیں ہوا۔ یہود اور ہادی جیسے یہودی شاعروں نے عربی میں اپنے فن کے شگوفے کھلائے، اسلامی اسپین میں یہودی وزیر بھی تھے، سائنٹسٹ بھی تھے اور شاعر بھی۔ مسلم طلیطلہ میں عیسائی یہودی اور مسلمان دانشوروں نے مل کر قدیم یونانی فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ وہ انسانی تہذیب کا یقیناً سنہرا دور تھا۔ کیا ایسا ہوسکتا تھا، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ''اسلام کو تلوار سے پھیلانے'' اور غیر مسلم کو تلوار کے نوک پر رکھنے کی تعلیم دی ہوتی۔

دوسری طرف اسلامی دنیا کا کیا حال رہا ہے، وہ تو مزید اس قابل ہے کہ اس کو کہا جائے اور سنایا جائے۔ عیسائیوں نے جب اسپین دوبارہ فتح کیا تو انہوں نے مذہبی دہشت گردی کی حکومت قائم کی۔ سنگدلانہ معاملہ نے یہودیوں اور مسلمانوں کے سامنے صرف تین راستے رکھے تھے۔ یا عیسائی ہو جائیں یا سب ذبح کردیئے جائیں یا یہ ملک چھوڑ دیں۔ جن لاکھوں لاکھوں یہودیوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا وہ کہاں گئے؟ انہوں نے ہجرت کی اور ان کو مسلم ملکوں میں کھلے دل سے خوش آمدید کہا گیا۔ اسپینی یہودی مغرب میں مراقش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور شمال میں بلغاریہ سے لے کر جو اس وقت عثمانی سلطنت کا حصہ تھا، جنوب میں سوڈان تک کے مسلم علاقوں میں بس گئے۔ کہیں ان پر مذہبی جبر نہیں ہوا۔ ان کو کہیں نسل کشی، اجتماعی ہجرت، مذہبی جبر اور قتل و خونریزی جیسی ان چیزوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جن کا سامنا ان کو تقریباً ہر عیسائی ملک میں کرنا پڑا۔ ہولوکاسٹ تو اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ قرآن کھل کر اہل کتاب کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم دیتا

بقیہ صفحہ 37 پر

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

احترامِ نسواں

محترم نصیر خاں، نوشہرہ

معاشرہ مرد وعورت کی ترکیب سے تشکیل پاتا ہے، اور اس کی تعمیر بھی دونوں کی مشترکہ کوششوں اور تعاون سے ہوتی ہے، دونوں جنسوں کا وجود معاشرے کے لیے یکساں مفید اور ضروری ہے اس لیے اسلام نے دیگر مذاہب اور معاشروں کے برعکس دونوں کے حقوق وفرائض میں توازن کو پیش نظر رکھا ہے۔

توازن اس معنیٰ میں کہ دونوں کو اپنی فطری ساخت، صلاحیتوں، نفسیات اور اپنی زندگی کے دائرہ کار کی ضروریات کے مطابق حقوق وفرائض دیئے ہیں، جو جنس جن فرائض کی اہلیت رکھتی ہے وہ اس کے سپرد کیے ہیں اور اسی کے مطابق اس کے حقوق متعین کئے ہیں۔

عورت قدرتی طور پر نازک بدن اور نازک جذبات رکھتی ہے۔ اس لیے اسلام نے اس پر بھاری ذمہ داریاں نہیں ڈالیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عورت کی نزاکت کے پیش نظر اس سے نرمی ولطافت کے سلوک کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وعاشروهن بالمعروف فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئا ويجعل الله فيه خيرا كثيرا﴾

(النساء:۱۹/۴)

اور ان کے ساتھ معروف طریقے پر گزر بسر کرو، اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں خیر کثیر ڈال دے۔ اس آیت میں یہ مفہوم شامل ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ دیگر تمام معاملات کی طرح عورتوں کے بارے میں بھی مثبت اور تعمیر سوچ اختیار کریں۔ بظاہر ایک معمولی غلطی یا نقص کو دیکھ کر بدسلوکی کا نشانہ بنائیں بلکہ ان کی دیگر خوبیوں پر نظر رکھیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان مردوں لیے پیدا کر رکھی ہیں۔

عورتوں کی اصلاح وتربیت مردوں کی ذمہ داری ہے لیکن اس کے لیے طریقہ ایسا اختیار کرنا چاہئے کہ وہ مزید بگڑنے کے بجائے اصلاح قبول کریں۔ اس کوشش میں ان کی فطری کمزوریوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"استوصوا بالنساء خيرا فإنهن خلقن من ضلع وانه اعوج شيء في الضلع اعلاه فإن ذهبت تقيمه كسرته وان تركته لم يزل اعوج فاستوصوا بالنساء"

(صحیح بخاری)

عورتوں کے بارے میں بھلائی کا تاکیدی حکم قبول کرو کیونکہ کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اس کو توڑ ڈالو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورت کے بارے میں تاکیدی حکم قبول کرو۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی اصلاح وتربیت میں محبت اور نرمی سے کام لینا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی نزاکت کا بے حد لحاظ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ام المومنین اور ایک صحابیہ اونٹ پر سوار تھیں۔ شتربان حدی خوانی کر کے اونٹ کو تیز تیز چلا رہا تھا تو آپ نے اس کو محتاط کرنے کے لیے فرمایا:

"يا انجشه! رويدك سوقا بالقوارير"

(صحیح بخاری)

اے انجشہ! آرام سے لے کر چلو،

اس کے اوپر آ بگینے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے کمال درجہ شفقت ومحبت کی بنا پر فرمایا ہے: "حبب الي من الدنا النساء والطيب وجعلت قرة عيني في الصلاة" (سنن نسائی)

مجھے دنیا میں سے عورتوں اور خوشبو کی محبت عطا کی گئی ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے: "اللهم اني اخرج حق الضعيفين اليتيم والمرأة" (سنن ابن ماجہ)

اے اللہ! میں دو ضعیفوں یتیم اور عورت کے حق کے ضیاع کو گناہ قرار دیتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے کچھ قبل آخری دفعہ حج پر تشریف لے گئے تو وہاں حاضرین حج کو اسلامی تعلیمات کے نچوڑ پر مشتمل خطبہ دیا جس کو خطبہ حجۃ الوداع کہتے ہیں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص عورتوں سے حسن سلوک کے بارے میں فرمایا:

سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کا تاکیدی حکم قبول کرو کیوں کہ وہ تمہاری زیر نگین ہیں اس کے سوا تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو کہ اگر وہ کھلی نافرمانی پر اتر آئیں تو ان کو بستر پر تنہا چھوڑ دو اور ہلکی مار مارو، اگر اطاعت کر لیں تو پھر زیادتی کی اجازت نہیں۔ سنو! تمہاری عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا تمہارے اوپر حق ہے۔ تمہارے حقوق میں سے یہ ہے کہ وہ ان کو تمہارے بستروں میں نہ بیٹھنے دیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ان کو نہ آنے دیں جن کا آنا تمہیں پسند نہیں اور ان کا حق تمہارے ذمے یہ ہے کہ ان کو عمدہ لباس اور کھانا مہیا کرو۔

ماحصل: اسلام وہ پہلا اور واحد مذہب ہے، جس نے عورتوں کو اس بلند اور ممتاز مقام تک پہونچایا، جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ آج بھی جب کہ اقوام عالم میں حقوق نسواں کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کسی ملک میں بھی عورت کو وہ احترام نصیب نہیں ہے، جس کا تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔ مغربی دنیا نے عورتوں کو تو ذمہ داریوں میں مردوں کے ساتھ برابر کر دیا لیکن حقوق ان کے عملاً مزید کم کر دیئے ہیں کیونکہ وہ مرد کی سرپرستی، کفالت اور تعاون سے محروم کر دی گئی ہیں۔ ان کو خود ہی اپنے اخراجات، برداشت کرنے ہیں اور خود ہی اپنی حفاظت کرنی ہے۔

مسلمان عورت ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کی صورت میں بے حد احترام کی مستحق ہے اس لیے مسلمان مردوں کو چاہئے کہ عورتوں کو ان تمام حیثیتوں میں عملاً بھرپور احترام دیں، کیوں کہ دنیا ان کی حقیقی حالت کو دیکھ کر ہی اسلام کی خوبی کو تسلیم کرے گی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی سرخروئی عمل ہی سے ہوگی۔ اس طرح ہماری مسلمان بہنیں مغرب کے اس نام نہاد تحریک نسواں کے برے اثرات سے بھی محفوظ ہوسکیں گی، جو بطور خاص ان ہی کو بگاڑنے کے لئے اسلامی ممالک میں پھیلائی جا رہی ہے۔ مسلمان بہنوں کو بھی چاہئے کہ خود کبھی اپنے حقوق کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے ساتھ اپنے ان فرائض کو بھی بجائیں جو اسلام نے ان پر بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت، شوہروں کی خدمت، وفاداری اور تعاون کے سلسلہ میں عائد کی ہیں۔

□□□

مجھے ڈر ہے کہ لوگ اللہ کو بھول جائیں گے

لوگ اس بیعت رضوان کے درخت کے پاس آئے جس کے پاس نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے عہد وپیمان لیا تھا، لوگ عقیدت سے اس درخت کو چھونے، پوچھنے اور اس کا ادب واحترام کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے اس کو کاٹنے کا حکم دے دیا، لوگوں نے پوچھا: کیونکر آپ اس کو کاٹنے کا حکم دے رہے ہیں جبکہ وہ بیعت رضوان کا درخت ہے؟ فرمایا: مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس درخت کی عقیدت میں گم ہو جائیں گے اور اللہ کو بھول جائیں گے۔

مولانا آزاد کی تربیت میں ان کی والدہ کا حصہ

شبانہ بیگم۔ظہیر آباد

مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام احمد محی الدین ابو الکلام لقب، اور آزاد تخلص کرتے تھے مولانا ابو الکلام آزاد ۱۸۸۸ کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پر آپ کی بسم اللہ خوانی ہوئی۔ ابھی عہد طفولیت میں ہی تھے کہ مکہ سے کلکتہ منتقل ہوئے اور کلکتہ کے قیام کے چند ہی دن گزرے تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس طرح آپ سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی ماں کی ممتا سے محروم ہو گئے۔ اور جب 20 سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کے والد ماجد اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔ اس طرح آپ بہت کم عمر میں ماں باپ کے دست شفقت سے محروم ہو گئے۔

امام الہند نے باضابطہ کسی مکتب میں داخلہ نہیں لے سکے جس کی ایک وجہ ترک وطن تھا تو دوسری طرف ان کے اعتبار سے والدہ کی بے وقت مفارقت کا غم تھا یہی وہ وجوہات تھیں جنہوں نے مولانا آزاد کو فرزند مکتب کے شرف سے محروم رکھا۔ البتہ اپنے والد محترم مولانا خیر الدین دہلوی (جو وقت کے جید عالم دین تھے) سے گھر پر ہی درس لیتے رہے اور ۱۰-۱۲ سال کی عمر میں دینی و دنیاوی علوم میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ باقاعدہ کسی مدرسہ کا طالب علم بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور خدا نے آپ کو غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی، جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے ۱۲ سال کی عمر میں عربی فارسی میں مکمل مہارت حاصل کر لی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں آپ درس دینے لگے یہ آپ کے قوی حافظہ کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ نے اتنی کم عمری میں تعلیمی میدان میں اتنی ترقی کر لی!

مولانا آزاد کو ایک اور خداداد صلاحیت یہ حاصل تھی کہ اللہ نے آپ کو تقریر و تحریر کی ایسی صلاحیت عطا کی تھی کہ کتنا ہی خاصہ مجمع کیوں نہ ہو آپ بلا جھجک مدلل اور واضح تقریر کرتے نہ صرف تقریر بلکہ آپ کی تحریر کا انداز بھی بڑا نرالہ تھا مختصر یہ کہ جب آپ کچھ تحریر کرتے تو قلم انگڑائیاں لینے لگتا اور زبان پر بھی آپ کو بہت مہارت حاصل تھی آپ کی تحریروں و تقریروں میں ایسا طلسم تھا کہ جو کوئی آپ کی تحریر پڑھتا، تقریر سنتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا یہی وہ دو وجوہات تھیں، جس کی بنیاد پر حکومت وقت نے آپ کو (مولانا آزاد) کو ابو الکلام جیسے معزز خطاب سے نوازا۔ مولانا کے انداز بیان سے متاثر ہو کر حسرت موہانی نے کہا:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

مولانا آزاد اپنی ذات میں ایک مکمل انسان تھے اور بیک وقت آپ میں کئی صلاحیتیں موجود تھیں، آپ معلم و مفکر، مجاہد آزادی، محب وطن بھی تھے ایک مفسر قرآن اور مصلح قوم بھی تھے اور بہترین مقرر و محرر بھی تھے۔ آج تک ہندوستان کو آپ جیسا بے لوث قائد و انسان شاذ و نادر ہی نصیب ہوا ہوگا۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے کے مصداق مولانا آزاد کی تربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ رہا۔ وہ عرب کی رہنے والی تھیں اور مشہور محدث شیخ احمد ظاہر وتری جیسے عالم کی بھانجی تھیں، جو مدینہ منورہ کے مفتی تھے۔ دراصل ان کے والدین تھے تو ہندوستان ہی کے باشندے مگر ہجرت

کر کے عرب میں جا بسے تھے وہیں آزاد کی والدہ نے تھوڑی بہت اردو سیکھ لی تھی اور آزاد کی تربیت کی ذمہ داری ان کی والدہ پر ہی تھی۔ مولانا کے اندر جتنی خوبیاں اور خصوصیات تھیں وہ تقریباً سبھی ان کی والدہ کی دین تھیں ان کی نیکی، شرافت اور نفاست نے سبھی کو متاثر کیا تھا آزاد کی والدہ ایک پابند شریعت اور عبادت گزار خاتون تھیں اور مذہبی علم کا خزانہ تو ان کو ورثہ میں ملا تھا اور اس کو انہوں نے طالب علموں میں تقسیم بھی کر دیا۔ رمضان کے مہینے میں تراویح کی نماز کے بعد مکہ کے معزز اور شریف خاندانوں کی عورتیں ان کے پاس جمع ہو جاتیں اور سحری کے وقت تک ان سے مذہبی مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرتیں۔

مولانا آزاد نے ان کی والدہ کی اخلاقی و مذہبی تعلیم و تربیت کے عملی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے بچپن کا ایک انوکھا واقعہ لکھا کہ ''میرے والد محترم نے ایک خوش نویس حافظ مبارک بخاری کو گھر پر رکھ لیا تھا تا کہ ان کی تصانیف کو تبیض کریں۔ وہ اپنے کپڑوں کی صفائی کا ذرا خیال نہیں کرتے تھے ایک دن میں نے اپنی ماں سے شکوہ کیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں میری والدہ نے نہایت دھیمی آواز میں مجھے تادیب و تلقین کی اور کہا کہ ''میری جان ایسا نہ کہو'' ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں تم سے اور ہم سے زیادہ عزیز ہوں'' اسی طرح باتوں ہی باتوں میں ان کی والدہ آزاد کو اخلاق کی تعلیم دیتی رہتی تھیں اپنی والدہ کی تربیت کے بارے میں مولانا آزاد نے ایک جگہ اور لکھا کہ ''میں والدہ کی اخلاقی اور دماغی بصیرت پر اس قدر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے بلند رتبہ کی تھیں وہ نہایت سخی و فیاض اور سرچشمہ تھیں۔ مفلس اور مصیبت زدہ آدمیوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہ جاتی والد مرحوم نے ایک مرتبہ ایک نہایت قیمتی دوشالہ ان کے لیے منگوایا جس دن انہوں نے اسے اوڑھا اسی دن ام حبیب ان سے ملنے کے لیے آئی یہ ایک غریب خاتون تھیں، جو ہمارے گھر کے قریب رہتی تھی اس نے ایسا قیمتی دوشالہ کبھی نہیں دیکھا تھا دوشالہ کا ایک پلہ ہاتھ میں لے کر حسرت بھری نگاہوں نے دیکھنے لگی اور زبان سے یہ الفاظ بے ساختہ نکل رہے تھے کہ ہم جیسے غریبوں کو ایسی چیزیں کہاں نصیب ہوتی ہیں اتنا سننا تھا کہ آزاد کی والدہ نے فوراً اپنے کاندھے سے دوشالہ نکالا اور اس کے کاندھے پر ڈال دیا۔ دیکھا آپ نے کتنی دریا دل فیاض اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور ظاہری بات ہے کہ شجر جیسا ہوگا اس کے پھل بھی ویسے ہی ہوں گے۔

مولانا آزاد کی والدہ نے اپنے لخت جگر کی تربیت میں ذرا بھی لاپرواہی نہیں برتی بلکہ انہوں نے آزاد کو نہ صرف دنیا بلکہ دین کی نعمتوں سے بھی مالا مال کیا اور نہ صرف ایک اچھا انسان بلکہ ایک فرض شناس شہری ایک باعمل مسلمان اور قوم و ملت کا خیر خواہ بھی بنایا۔ مختصر یہ کہ مولانا آزاد کی والدہ نے ماں کی گود پہلی درسگاہ ہونے کا مکمل حق ادا کیا۔ بقول علامہ اقبال:

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

والدہ کی تعلیم کا ثمرہ تھا کہ آپ نے ملک قوم کے لیے اتنی خدمات انجام دیں۔ بظاہر مولانا آزاد کسی اعلیٰ درسگاہ یا کوئی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تو نہیں تھے ہاں البتہ پہلی درسگاہ میں آپ بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ کئے گئے تھے اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ نے تعلیمی میدان میں بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ شاید اسی وجہ سے آپ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور آج بھی آپ کے یوم پیدائش کو یوم تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ تھی پہلی درسگاہ کی تعلیم اور اس کے اثرات۔

مولانا آزاد کی والدہ کی تربیت کے ان واقعات میں ہمارے لیے تمام چیزیں قابل تقلید ہیں لیکن ان میں دو باتیں انتہائی سبق آموز ہیں، جس کو اپنی بساط کے مطابق اجاگر کروں گی؟ کوئی بھی انسان پیدائشی اعتبار سے اچھا یا برا نیک یا بد نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں آنے کے بعد اگر یہاں

کے صحیح ماحول میں اس کی تربیت ہوتو وہ اچھا انسان بن سکتا ہے اور اگر نامناسب تربیت ہوتو وہ سماج اور والدین کے لیے دردسر بھی بن جاتا ہے اور بچوں کی تربیت میں والدین کا بڑا حصہ ہوتا ہے بالخصوص والدہ کا - یا یہ کہنا ہوگا کہ بچوں کی تربیت مستقل فن ہے، جس کا ہر والدہ کو سیکھنا ضروری ہے لیکن عموماً مائیں اس پر توجہ نہیں دیتی، جس کے نتائج وہ اپنی پیرانہ سالی کے زمانہ میں دیکھتی ہیں۔ والدین پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت اسلامی نہج پر کریں اور شروع سے ہی (یعنی باشعوری کی عمر سے ہی) نماز روزے کی تلقین کریں اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم سے بھی آراستہ کریں۔ لیکن فی زمانہ والدین اپنے بچوں کو اسکول میں داخلہ دلوا کر اپنے کو بری الذمہ سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تربیت کا پورا پورا حق ادا کیا حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

آج کئی والدین ایسے ہیں، جو خود نمازوں کا اہتمام نہیں کرتے تو اپنی نسل کو کیا اس کی تلقین کریں گے۔ مشاہدہ کی بات ہے کہ اکثر بچے اپنے والدین سے اپنے اسکولی اساتذہ کی شکایت کرتے ہیں، جس پر والدین بجائے بچوں کو تنبیہ کرنے کے بچوں کی باتوں کو بنیاد بنا کر اساتذہ سے استفسار کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمارے مولانا آزاد کی والدہ کا عمل قابل تقلید ہے۔ مختصر یہ کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے اس اعتبار سے ماں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی آغوش میں پروان چڑھنے والی نسل کی تعلیم وتربیت کے معاملہ میں کوئی کسر نہ رکھیں۔ ❖❖❖

اختلاف امت اوران کا حل.....کا.....بقیہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مذہبی معاملات میں جس شخص نے کوئی رخ خاص اختیار کر رکھا ہے، وہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ تعلیم وتلقین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہی ہو مگر اس کا نظریہ کم از کم یہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے۔ ان حالات میں اس کو ہمدردی اور نرمی سے اپنی جگہ افہام وتفہیم کی کوشش تو بجائے خود جاری رہنا چاہئے۔ لیکن جب تک اس کا نظریہ، نہ بدلے اس کو یہ دعوت نہیں دی جاسکتی کہ تم ایثار کر کے اپنا نظریہ چھوڑ دو اور صلح کرلو۔ ان سے تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف رائے کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور افہام وتفہیم، قرآنی اصول حکمت و موعظت **مجادلہ باللتی ھی احسن** کو نظر انداز نہ کریں۔ مگر جن معاملات کا تعلق صرف شخصی اور ذاتی حقوق اور خواہشات سے ہے، وہاں یہ معاملہ سہل ہے کہ جھگڑے سے بچنے کے لیے دوسرے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دے۔ اپنے حق سے دست بردار ہوجائے اور جو شخص ایسا کرلے دنیا میں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور جس مقصد کو چھوڑا ہے وہ بھی دوسرے راستے سے حاصل ہوجاتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے ایک عظیم الشان بشارت ہے، جس کا بدل پوری دنیا اور دنیا کی ساری حکومتیں اور ثروتیں بھی نہیں ہوسکتی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

''میں ضامن ہوں اس شخص کو وسط جنت میں مکان دلانے کا جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑنا چھوڑ دیا۔''

میں آخر میں پھر اپنے جملے کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہمارے ساری خرابیوں کی بنیاد قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت یا غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔ گروہی تعصبات نے یہ حقائق نظروں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔ دنیا میں صالحین کی اگر چہ قلت ہے مگر فقدان نہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے مصلحین کا سخت قحط ہے جو گردوپیش کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے سر نکال کر باہر دیکھیں اور اسلام اور قرآن ان کو کس طرف بلا رہا ہے؟ ان کی صدا سنیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے راستے پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں، آمین۔ ❖❖

والدین کی خدمت دخول جنت کا ذریعہ

انجم فاطمہ

انسان کے لئے سب سے بڑی خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کے احسان کو مانے اور پھر تن من دھن سے اس کا ہو رہے، اس کے حلال کو حلال جانے اور حرام کو حرام اور جس میں اسکی رضا ہے کریں اور جس میں ناراضگی ہے اس کو چھوڑ دیں۔ چونکہ یہی اصل ایمان ہے اور ذریعہ نجات اور جنت کا ضامن ہے۔ ان ہی نعمتوں میں سے ایک نعمت والدین کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، جس پر بندہ کو شکر بجالانا لازم ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''میرا شکر کرو اور اپنے والدین کے بھی احسان مند رہو۔'' اللہ تعالیٰ نے اس لیے احسان مند رہنے کا حکم دیا ہے کہ ماں باپ دنیا میں ہر طرح کی پرورش وتربیت کرتے ہیں، لہٰذا انسان جب ماں کے رحم میں ہوتا ہے تو ماں اس کے حمل کے زمانے سے ولادت کے زمانے تک طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتی ہے، پھر جب وہ پیدا ہوجاتا ہے تو اس کو دودھ پلاتی ہے اور اس کو پاک وصاف رکھتی ہے، پھر اس کی تکلیفوں کو برداشت کرتی ہے اور اس پر آرام وراحت، جان ومال قربان کردیتی ہے اور یہی نہیں، بلکہ اس کو کوئی تکلیف نہیں پہونچنے دیتی۔ اسی طرح باپ اس کو نہ صرف دل سے محبوب سمجھتا ہے بلکہ کھانے پینے کی تمام ضروریات مہیا کرنے میں انتہائی درجہ کی کوشش کرتا ہے اور اس کا سارا بوجھ وبار اپنے سر لیتا ہے، اس لیے پروردگار کے بعد والدین کی فرمانبرداری کرنا اولین فریضہ ہے اور والدین کی خوشنودی کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ترمذی شریف جلد دوم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی خوشی والدین کی خوشی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔ اور ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے والدین کا فرمانبردار ہے، اس کے لیے صبح ہی کو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر والدین میں سے ایک ہی ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ والدین کے متعلق خدا کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے صبح ہی کو جہنم کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ایک ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے۔ ایک شخص نے کہا: اگر چہ ماں باپ ظلم کریں؟ فرمایا: اگر چہ ظلم کریں، اگر چہ ظلم کریں، اگر چہ ظلم کریں۔ اور فرمایا: جب اولاد اپنے والدین کی طرف نظر رحمت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر نظر کے بدلے حج مبرور کا ثواب لکھتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا، اگر چہ دن میں سو مرتبہ نظر کرے؟ فرمایا ہاں، اللہ بڑا ہے اور اطیب ہے، یعنی اسے سب کچھ قدرت ہے، اس سے پاک ہے کہ اس کو اس کے دینے سے عاجز کہا جائے، والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کو نفل عبادت سے بڑھ کر درجہ عطا کیا گیا، چنانچہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ماں باپ تمام چیزوں سے بڑھ کر ہیں۔ حضرت جاہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ: ''میرا ارادہ جہاد میں جانے کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ لینے حاضر ہوا ہوں، ارشاد فرمایا: تیری ماں ہے؟ عرض کیا ہاں! فرمایا اس کی خدمت لازم کرلو، جنت اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

احسان وسلوک میں ماں کا مرتبہ باپ

سے تین گنا بڑھ کر ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! سب سے زیادہ حسن سلوک یعنی احسان کا مستحق کون ہے؟ ارشاد فرمایا تمہاری ماں! یعنی ماں کا حق سب سے زیادہ ہے، انہوں نے پوچھا، پھر کون؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ماں۔ انہوں نے پوچھا۔ پھر کون؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ماں۔ انہوں نے پوچھا، اس کے بعد؟ فرمایا: تمہارے والد۔

ابن ماجہ نے ابو امامہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا وہ دونوں تیری جنت ودوزخ ہیں، یعنی ان کو راضی رکھنے سے جنت ملے گی اور ناراض رکھنے سے دوزخ کے مستحق ہوں گے۔ اور انہیں کی خدمت کے ذریعہ گناہوں کی تلافی ہوگی، بارگاہ الٰہی میں قبول دعا کا ذریعہ ہوگی۔ ترمذی نے ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسول اللہ! میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے، آیا میری توبہ قبول ہوگی؟ فرمایا تیری ماں زندہ ہے، عرض کیا، نہیں، فرمایا: تیری کوئی خالہ ہے؟ عرض کیا ہاں، فرمایا اس کے ساتھ احسان کر۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ نعمت اولاد کے حق میں ان کی زندگی میں عطا کی ہے وہیں پر والدین کی رحلت فرما جانے کے بعد بھی یہ نعمت لامتناہی جاری رہی گی، جیسا کہ ابو داؤد ابن ماجہ نے ابی اسید ساعدیؓ کی روایت نقل کی ہے: کہتے ہیں؟ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر تھے، کہ بنی مسلمہ کا ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے والدین وفات پا چکے ہیں، اب بھی ان کے ساتھ احسان کا کوئی طریقہ باقی ہے؟ ہاں، ان کے لیے دعا واستغفار کرنا اور جو انہوں نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرنا اور جس رشتہ والے کے ساتھ انہیں کی وجہ سے سلوک کیا جاسکتا ہو اس کے ساتھ سلوک کرنا اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا، ایک روایت کے مطابق فرمایا کہ کسی کے ماں باپ دونوں یا ایک کا انتقال ہوگیا اور یہ ان کی نافرمانی کرتا تھا، اب ان کے لئے ہمیشہ استغفار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکو کار لکھ دیتا ہے۔

الغرض اطاعت والدین سے دین ودنیا کی بے شمار برکتیں حاصل ہوتی ہیں، دل کو سکون ملتا ہے، روح میں تازگی پیدا ہوتی ہے، ایمان میں استقامت آتی ہے، اسرار ورموز کی راہیں کھلتی ہیں، رزق میں اضافہ ہوتا ہے، درجات میں بلندی ہوتی ہے، نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے، ذات حق کی قربت حاصل ہوتی ہے، اطاعت والدین سے عشق رسولؐ میں بھی اضافہ ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ اطاعت میں فائدہ ہی فائدہ ہے، لہٰذا ہر شخص کو دل وجان سے اطاعت والدین کی کوشش میں رہنا چاہئے۔

■■■

دین کا نبوی مزاج ..... کا ..... بقیہ

نہ ہو، گول ہو تو خدا کا دیدار قیامت کے دن سب کو کیسے ہوگا؟ بائبل کی یہ تشریح غلط ثابت ہوگئی اور زمین کے گول ہونے کا نظریہ تسلیم کرلیا گیا، بائبل پر بھی قدرتاً اس کا اثر پڑا، اس کی حقانیت پر، اس کے منزل من اللہ اور کلام الٰہی ہونے پر بھی اثر پڑا۔

آخری بات عقیدہ آخرت کا اہتمام ہے وہ انبیاء کرام کی دعوت کا بنیادی نقطہ ہے، جو لوگ انبیاء کرام کے اقوال واحوال کے مطالعہ میں زندگی گزارتے ہیں اور ان کے کلام کا صحیح ذوق رکھتے ہیں، وہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے ہوتی ہے اور اس کی تصویر (نعمت ومصیبت اور سعادت وشقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ) ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے، وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں یہ بات ان کے لیے بالکل مشاہدہ اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کے شعور واحساس اعصاب اور قوت فکر پر غالب آجاتا ہے۔ ❖❖❖

اسلام کے نظریۂ یوم حساب نے
مجھے مسلم بنادیا

میں گریک نوح (Greg Naaks) فورٹ ورتھ ٹیکساس کے ایک پروٹسٹنٹ (عیسائی) گھرانے میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ ایک عیسائی بچے کی حیثیت سے چرچ میرے لیے اخلاقی اقدار اور رہنمائی کا ایک اہم ذریعہ تھا اور ایک کسوٹی تھا، جو صحیح کو غلط سے اور اچھائی کو برائی سے الگ کرکے دکھائی تھی، جس عیسائی فرقے سے میرا تعلق تھا وہ معقول حد تک آزاد خیال تھا، تاہم چرچ میری ذہنی یا سماجی سرگرمیوں کا لازمی جزو تھا۔ شاید یہ اس لیے بھی میری دلچسپی کا مرکز نہ تھا کہ اس میں جو کچھ اتوار کو بتایا جاتا اس کا باقی ایام یعنی عملی روزمرہ زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

کالج جانے کا وقت آیا تو میں نے ورجینا یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ یونیورسٹی کا شعبہ تعمیرات وڈیزائن جس میں میرا داخلہ ہوا کئی طرح کے معاشرتی علوم اور بیرونی زبانوں کے کورسز بھی کرواتا تھا۔ تاریخ میرے لیے ہمیشہ سے پسندیدہ موضوع رہا ہے اس لیے اس موضوع پر کورسوں کی فہرست کا جائزہ لے کر میں نے شرق اوسط کی تاریخ پر تعارفی کورس کرنے کی ٹھان لی۔ کالج میں داخلے کے وقت عرب اور مسلم دنیا کے باری میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مزید برآں یونیورسٹی اور مذکورہ علاقے کے درمیان طویل فاصلہ حائل تھا، پھر بھی مجھے خیال آیا کہ یہ کورس میرے لیے مفید ثابت ہوگا۔ میں نے دوران تعلیم اسکول میں فرانسیسی زبان پڑھی تھی اور اب تبدیلی کا خواہش مند تھا چنانچہ میں نے عربی زبان کا کورس بھی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یوں عرب زبان کی صورت میں ایک واضح تبدیلی میسر آگئی، اس طرح دن گزرنا شروع ہوگئے حتیٰ کے شرق اوسط میں میری دلچسپی فن تعمیر سے بھی زیادہ ہوگئی اور ایک سال بعد یہ عالم ہوگیا کہ میں اپنے شعبے کو چھوڑ کر شعبہ تاریخ میں منتقل ہوگیا، جہاں اب میری کورس اور تحقیق کا محور عرب دنیا بن گئی۔ بعد ازاں میں گریجویٹ اسکول چلا گیا اور شرح اوسط کے علوم میں داخلہ لے لیا، جس میں شمالی افریقہ کا وسیع علاقہ بھی شامل تھا۔ واشنگٹن پوسٹ میں میرے نیوز ایڈیٹر بننے کے بعد سے لے کر گریجویشن تک شرق اوسط کے حالات و واقعات کا مطالعہ جاری رہا۔

ان چند کورسز اور ان کو پڑھانے والے پروفیسروں نے درحقیقت میری زندگی کا رخ بدل ڈالا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی تعلیمات کے متعلق کلاسیں پڑھنے اور مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنے کو کہا گیا۔ یوں پہلے جو کچھ محض کورس کا نصاب تھا بتدریج میری ذات کے لیے ایک اور طرح سے اہمیت اختیار کرتا چلا گیا اور جوں جوں اسلام سے متعلق میرا مطالعہ وسیع ہوتا گیا، اسی تناسب سے اسلام میرے لیے دلچسپ اور دلکش ہوتا چلا گیا۔ کوئی تین سال کے مطالعے، جستجو اور غور وخوض کے بعد میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا، ایک دم سے نہیں بلکہ میں نے خود سے کہا کہ فیصلہ سے پہلے خوب سوچ لو کہ اسلام قبول کرنے سے مراد کیا ہے اور ساتھ ہی عقیدہ کے علاوہ اسلام کے عملی پہلوؤں پر بھی غور کرلو، جن کے متعلق ابھی تک مجھے کافی علم نہیں تھا۔ مجھ پر یہ واضح ہوگیا کہ کلمہ شہادت میری زندگی کا سب سے اہم ترین واقعہ ہوگا۔ چنانچہ میں اپنی لگن اور اہلیت کا یقین کرلینا چاہتا تھا کہ واقعی اس عہد کو نبھاسوں جسے ایمان لانے کی صورت میں کرنے والا تھا۔ بالآخر ۱۹۸۹ء

کے موسم گرما میں، میں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ یہ سوال کہ میں مسلمان کیوں ہوا، اکثر مسلمانوں اور غیر مسلموں سے گفتگو کے دوران میں مجھ سے کیا جاتا ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں اسلامی کی خوبیوں کی ایک مشینی انداز میں فہرست گنوانا، اسلام کی خوبصورت اور دلکشی گنانے کے مترادف ہے، کیونکہ چھوٹی بڑی ہزاروں وجوہ ہیں جو میرے اسلام لانے کا باعث بنیں۔ تاہم تین نمایاں باتیں یہ ہیں:

☆ یہ اسلام کے یوم حساب کا نظریہ تھا، جس نے میری روح کے تاروں کو چھیڑ دیا کہ ہر مرد اور عورت اپنے اعمال کے لیے ایک انتہائی عادل اور رحیم ذات کے سامنے جوابدہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا عدل جس میں رحمت کا پہلو بھی موجود ہو، اس کائنات کی سب سے قیمتی شے ہے۔ ہمیں غلط اور صحیح میں امتیاز کر کے اس کے مطابق عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اور اہلیت دی گئی ہے۔ ہماری تمام اعمال اور ارادے کسی نہ کسی مقصد کے حامل ہوتے ہیں، بے مقصد نہیں ہوتے، اسلام کے مطابق ان کے اچھے یا برے نتائج کا سامنا انسان کو کرنا پڑے گا۔

☆ میں نے اسلام اور عیسائیت کی اخلاقی اقدار میں کافی حد تک مماثلت پائی اور اسلام نے مذہب سے متعلق کئی ایک سوالوں کے تسلی بخش جواب فراہم کر دیئے، جن کا جواب عیسائیت کے بس کی بات نہیں تھی، مثلاً توحید باری تعالیٰ، تثلیث کی بھول بھلیاں جو کبھی اطمینان بخش طریقے سے خود کو مجھ پر واضح نہ کر سکیں۔ یہ محض الفاظ کا گورکھ دھندہ ہیں۔

☆ ایک اور نہایت اہم بات یہ کہ ہر مسلمان بغیر کسی پادری وغیرہ کے درمیانی سہارے کے اللہ تک رسائی رکھتا ہے اور آخری بات قرآن حکیم کا ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہونا کہ جس طرح یہ صدیوں پہلے محمد ﷺ کی زبان مطہرہ سے انسانیت کو موصول ہوا، آج بھی اسی خالص حالت میں محفوظ ہے، عربی زبان میں ہے جو کہ اسی طرح زندہ اور مروج ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام کے وقتوں میں تھی۔ اس کے برعکس حضرت عیسیٰ آرامی زبان بولتے تھے لیکن بائبل یونانی زبان میں لکھی گئی۔ پھر لاطینی زبان اور بعد میں انگریزی، فرانسیسی، اسپینی، جرمن اور دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا، مگر اس کی اپنی زبان محفوظ نہیں ہے جو کہ قرآن کے مقابلے میں پیش کی جا سکے۔ دو مختلف زبانیں جاننے والا شخص جس نے کبھی ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا ہو، جانتا ہے کہ اس ترجمے کے دوران میں کچھ نہ کچھ ضرور ترجمہ ہونے سے رہ جاتا ہے مزید برآں جملوں کی معنوی باریکیاں اور الفاظ کی ضمنی تعبیریں لا محالہ ترجمے کے دوران میں قربان ہو جاتی ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انگریزی میں ترجمہ شدہ بائبل کے کسی اقتباس کا حوالہ دے کر قطعیت کے ساتھ کہا جائے کہ یہ حضرت عیسیٰ یا حضرت ابراہیم کے الفاظ یا تعلیمات ہیں؟ اس کے برعکس مسلمان اپنے اللہ کے فرامین تک براہ راست رسائی رکھتے ہیں اور اس طرح اپنے خالق کی منشا کی خالص ترین شکل میں پیروی کر سکتے ہیں۔

بات صرف اتنی نہ تھی کہ مجھے مذہب کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا اور اسلام اور مسلمانوں جن سے متعلق پہلے کبھی علم نہ تھا، معلومات حاصل ہو گئی تھیں بلکہ اہم بات یہ تھی کہ انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت جسے ایمان کہتے ہیں، سے میرا اولین تعارف اب ہوا ہے۔ میں نے مزید کریدا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتب زیر مطالعہ آئیں۔ الغرض میں نے اس تناظر میں جتنا ممکن تھا کوشش کی۔ اس سلسلے میں کیمپس میں موجود مسلمان طالب علموں سے بھی جا جا کر ملا مگر جس چیز نے واقعی میری توجہ کو گرفت میں لیا وہ چند لکھنے والوں کی تحریریں تھیں جن میں خاص طور پر چارلس لیگائے ایسٹز کی معرکتہ الآراء تحریر ''اسلام اور تقدیر انسانی''، فضل الرحمٰن صاحب کی ایمان سے متعلق تجزیاتی تحریر جو ''اسلام'' کے سادہ ٹائٹل میں طبع ہوئی، غیر

مسلموں میں سے مارشل ہو جس کی تین جلدوں پر مشتمل The Venture of Islam شامل ہیں۔ میں بعض اوقات آج بھی اپنے آپ کو کتابی کہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے جستجو کے ذریعے سے جانا کہ اسلام وہ دین ہے، جس میں ایسی اخلاقی تعلیمات کا پرچار ہے، جو ان تعلیمات کے قریب تر ہیں، جو مجھے میرے والدین نے دیں، یعنی اللہ پر ایمان، تکریم انسانیت، صداقت، حسن خلق، غمگساری اور خودداری وغیرہ لیکن جو چیز اسلام کو ایک آفاقی مذہب بنا دیتی ہے وہ اس کا واضح اور بھرپور نظام حیات ہے، جس میں تمام اعلیٰ اقدار آپس میں گندھی ہوئی اور مربوط ہیں۔ بظاہر اسلامی تعلیمات سادہ اور آسان مگر درحقیقت نہایت پرمغز اور ارفع درجے کی ہیں۔ لا الہ الا اللہ یوں تو چند الفاظ ہیں، جو زبان سے تین سیکنڈ میں ادا ہو جاتے ہیں مگر ایک انسان اس کی حقیقت کو پانے میں زندگی کھپا سکتا ہے۔

جب سے میں مسلمان ہوا ہوں، میرے عمل میں وسعت آئی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ ایمان کس چیز کا نام ہے، حالانکہ میں ابھی اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کا محض اجمالی مطالعہ کر سکا ہوں۔ نیز میں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسلم امہ کے ہمہ جہتی پہلوؤں اور مسلمانوں کے مختلف نظریات و آراء سے بھی متاثر ہوا ہوں، جو متنوع قسم کے جغرافیائی نسلی اور لسانی پس منظر رکھنے کے باوجود ایک امت ہیں۔ یہ وسعت اور ہمہ گیری اس تصور کے برعکس ہے، جو اسلام لانے سے پہلے میں رکھتا تھا اور اسلام کو محض چند رسموں تک ہی محدود خیال کرتا تھا۔ اب معاملہ قطعاً مختلف ہے اور میں اس قابل ہوں کہ اسلام کی ہمہ گیری کا ادراک کر سکوں، ایک ایسے دین کا جو تمام وقتوں کے تمام لوگوں کے لیے ہے اور میری طرح اسلام لانے والوں (جنہوں نے اسلام کا انتخاب کیا ہے) کے خیال میں موجود دور اسلام کی تبلیغ کی ترغیب دلانے اور اسلام کے لحاظ سے ولولہ انگیز ترین ہے۔

❖❖❖

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار..... کا..... بقیہ

ہے۔ ہر ایماندار یہودی جو اپنی قوم کی تاریخ سے اچھے سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر ایماندار یہودی، جو اپنی قوم کی تاریخ سے واقف ہے وہ اپنے آپ کو دل کے خلوص کے ساتھ اسلام کا احسان مند مانے گا۔ جس اسلام نے یہودیوں کو پچاس نسلوں تک تحفظ دیا۔ جب کہ عیسائی دنیا نے ان پر لگاتار ظلم کیا اور ایذا رسانی کے تحت رکھا اور بارہا کوشش کی کہ ان کو تلوار کے ذریعہ اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔

بہر حال، اسلام کا تلوار سے پھیلنا ایک بدترین افسانہ ہے، جو ان جھوٹی داستانوں میں سے ہے، جو یورپ نے مسلمانوں کے ساتھ جنگوں کے زمانہ میں گڑھی تھیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ پوپ نے یہ نامعقول بات کیوں دہرائی؟

اس کا بس ایک ہی سبب ہے اور کچھ نہیں اس کو تو بش اور ان کے ایوانجیلسٹ حامیوں کی اسلام کے خلاف ''صلیبی جنگ'' کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بش کے آقاؤں کو دنیا کے تیل کے ذخیروں پر قبضہ کرنے کی بے حیا کوششوں کو جواز فراہم کرنے کے لیے کچھ بہانے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پوپ پوری کر رہا ہے۔

تاریخ میں ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے کہ طمع و لالچ کے ننگے شیطانوں کو مذہبی چوغے پہنائے جا رہے ہیں اور ان کی عریاں ہوسنا کیوں پر تقدس کی مالائیں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے کہ ڈاکوؤں کے شب خون کو مقدس جنگ قرار دا جا رہا ہے۔ پوپ کی تقریر اسی قسم کی حرکت ہے۔

●●●

سعودی عرب میں جرائم کی شرح بہت کم

مفتی اشتیاق احمد

سعودی عرب دنیا کا وہ واحد ملک ہے، جہاں جرائم کی شرح پوری دنیا کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے شرعی عدالتوں کے قیام بلا تاخیر انصاف میسر آتا ہے۔ یہاں پر بسنے والے سعودی باشندے اور غیر ملکی فوری اور جلد انصاف کے نظام اور طریقہ کار سے سو فیصد مطمئن ہیں اور چاہتے ہیں کہ سعودی عرب کی طرح پوری دنیا میں یہ نظام قائم ہوجائے۔ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی وجہ سے سعودی عرب امن وآشتی کا گہوارہ بن چکا ہے۔ سعودی عرب کے فرماں روا خادم الحرمین شریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نرم گوشہ اور اپنی قوم اور مسلم امہ کیلئے انتہائی ہمدرد دل رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں ہر مسلمان کی تکلیف کا درد دھڑکتا ہے۔ اپنی خوبیوں اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے وہ نہ صرف سعودی عوام بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی نظروں میں عظیم شخصیت کے حامل ہیں۔ سعودی عرب میں شرعی قوانین کے نفاذ کے

شرعی سزاؤں پر فوری عمل درآمد، سابق سرکاری جلاد سعید بن عبداللہ سے بات چیت

وجہ سے ہر جرم کی سزا کا قانون موجود ہے اور جرم ثابت ہوجانے پر کسی عدالت میں اپیل کی کوئی گنجائش نہیں۔ سعید بن عبداللہ بن مبروک البشی ''جلاد'' کی حیثیت سے اب تک مختلف اعضاء جسم سے کاٹ کر الگ کرچکے ہیں۔ ۶۰ سال کی عمر تک وہ یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے انہوں نے ۲۴ شادیاں کیں، جو تمام کامیاب ہوئیں اور اولاد میں ۲۵ لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ پہلی شادی کے موقع پر حق مہر صرف ۵ سعودی ریال رکھا گیا تھا۔ اپنے ماضی کے اوراق کو پلٹتے ہوئے سعید بن عبداللہ نے کہا کہ میرا خاندان ایک متوسط گھرانے پر منحصر تھا۔ میں سعودی عرب کے شہر بیشہ میں بیروزگار تھا۔ تلاش معاش کی جستجو میں ریاض آ گیا، کیوں کہ جسمانی طور پر میں بہت طاقتور اور مضبوط تھا یہاں آ کر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس وقت میری ماہانہ تنخواہ ۱۳۰ ریال تھی۔ اپنی ملازمت کے دوران اکثر ریاض میں مختلف جرائم میں ملوث افراد کے سر قلم ہوتے دیکھتا تھا۔ میرا یہ شوق آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا اور جب میں کوئی سر قلم ہوتا دیکھتا تو سر قلم ہونے کے تمام عمل کو بغور اور گہری نظر سے دیکھتا۔ میرے ایک دوست کو جب میری اس دلچسپی کا علم ہوا تو ایک دن وہ مجھے گورنر ہاؤس (عمارہ) میں لے گیا اور انہوں نے مجھے سرکاری ''جلاد'' کے طور پر وزارت داخلہ میں منتخب کرلیا اور ماہانہ تنخواہ کے علاوہ ۵۰۰ ریال ہر ایک سر قلم کرنے کا معاوضہ طے کیا۔ سعید بن عبداللہ نے کہا کہ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ۲۵ سال کی عمر میں مجھے پہلی بار ریاض میں جمعیۃ المبارک کے روز تین اشخاص کے سر قلم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، جسے میں نے پوری ذمہ داری، جرأت ہمت اور احسن طریقہ سے پورا کیا اور اس طرح میری آمدنی میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری تنخواہ صرف ۱۳۰ ریال ہوا کرتی تھی۔

سعید بن عبداللہ نے جلاد کے فرائض انجام دینے کے بارے میں مزید کہا کہ سر قلم کرنا تو ہاتھ کاٹنے کی نسبت بہت ہی آسان کام ہے، ہاتھ کاٹنے میں ایک تو وقت بہت صرف ہوتا ہے، دوسرے یہ کام انتہائی مہارت اور توجہ سے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے

لئے پہلے 'کلائی پر نشان لگایا جاتا ہے اور پھر تیز دھار خنجر سے نشان زدہ جگہ پر سے ہاتھ کو الگ کرنا پڑتا ہے۔ جب ہاتھ الگ ہوجاتا ہے تو پھر زخم والے حصہ پر تیل لگادیا جاتا ہے تاکہ ہاتھ کٹنے کے بعد زخم کا منہ بند ہوجائے اور جسم کا مزید خون نہ بہے۔ اس تمام عمل میں تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جس مجرم کا ہاتھ کاٹنا ہو وہ سامنے بیٹھا ہوتا تھا، وہ مسلسل میری طرف رحم بھری نظروں سے دیکھتا رہتا اور جب تک میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچادیتا اس کی طرف نظروں سے نظریں ملا کر دیکھتا مشکل ہوتا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں رحم، غصہ اور ندامت وشرمندگی کے ملے جلے جذبات نمایاں رہتے۔ مگر اس کے مقابلے میں جسم کا سر تن سے جدا کرنا نسبتاً آسان ہوتا، اس کا سر کیوں کہ نیچے کی طرف جھکا ہوتا، اس لئے تلوار کے ایک ہی وار سے اور ایک ہی ثانیہ میں اس کا کام تمام ہوجاتا۔ سعید بن عبداللہ نے کہا کہ جن ہتھیاروں کی مدد سے یہ کام سرانجام دیتا تھا ان کا میں خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ عام طور پر تین قسم کے اوزار استعمال میں لائے جاتے۔ سر قلم کرنے کے لئے 'تلوار'، کلائی کاٹنے کے لئے 'خنجر' اور عورتوں کے لئے پستول استعمال کیا جاتا۔ کیونکہ عورتوں کے سر کے بال گردن اور پشت پوشیدہ ہوتی ہے اور سر کاٹنے کے لئے گردن کا بالکل صاف اور واضح نظر آنا ضروری ہوتا ہے تاکہ صحیح جگہ پر کاری ضرب لگائی جاسکے اور ویسے بھی یہ شرعاً اجازت نہیں کہ کوئی غیر مرد کسی عورت کو ہاتھ لگائے یا پھر اس کی گردن کو ہاتھ لگائے، اس لئے جب کسی عورت کو ''قصاص'' میں قتل کرنے کا شرعی حکم صادر ہوتا ہے تو اس کے لئے پستول ہی استعمال کی جاتی ہے۔ سعید بن عبداللہ نے اپنے ماضی کے واقعات کی پردہ کشائی کرتے ہوئے مزید کہا کہ مجھے تین روز قبل اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں دن تمہیں سر قلم کرنا ہے ایک عام آدمی کی طرح میں بھی کبھی کبھار سوچتا کہ اس نے آخر کیا جرم کیا ہوگا، جس کی وجہ سے اسے سزا دی جارہی ہے۔ سر قلم کرنے سے قبل ایک رات مجھے نیند نہیں آتی تھی کہ کیا میں کل صبح اپنی ذمہ داری کما حقہ پوری بھی کرسکوں گا یا نہیں، اس کی گردن ایک ہی تلوار کے وار سے کٹ جائے گی یا پھر دوسرے وار کی ضرورت پڑے گی۔ سعید بن عبداللہ نے کہا کہ اب تک انہوں نے ایک دن میں اور ایک وقت میں سب سے زیادہ ۱۲ گردنیں کاٹی ہیں۔ ان میں سے ان کے دوسرے ساتھی کو ۱۵ اشخاص کی گردنیں کاٹنا تھیں۔ اس کام کے لئے دو آدمی مامور تھے، ان میں سے ۱۲ کی گردنیں انہوں نے اور تین ان کے دوسرے ساتھی نے اڑائیں۔ سعید بن عبداللہ نے وضاحت کی کہ مجھے اس وقت روحانی خوشی ہوتی تھی جب کسی شخص کو شرعی عدالت کے فیصلے کے مطابق ''قتل کا بدلہ قتل'' کے سلسلے میں گردن اڑانے کا حکم سنایا جاتا تھا اور تمام تیاریاں مکمل ہوچکی ہوتی تھیں کہ عین آخری لمحے میں مقتول کے لواحقین یا ورثا آ کر مجرم کو معاف کردیتے اور وہ شخص موت کے منہ میں جانے سے بچ جاتا ہے۔ اب تک اس قسم کے تین واقعات مکہ مکرمہ، جدہ اور باحاالندہ میں ہوچکے ہیں۔ سعید بن عبداللہ کے بعد سر قلم کرنے کی یہ ذمہ داری ان کے صاحب زادے پوری کررہے ہیں اور اپنے والد کے کام کو فرض شناسی کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔ ○○○

مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی دامت برکاتہم
کی تصنیفات
طلب کریں
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ
P.Box 119, Nadwa, Lucknow. Ph. :2741539

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
کی تصنیفات
طلب کریں
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ
P.Box 119, Nadwa, Lucknow. Ph. :2741539